ڑولتیّا

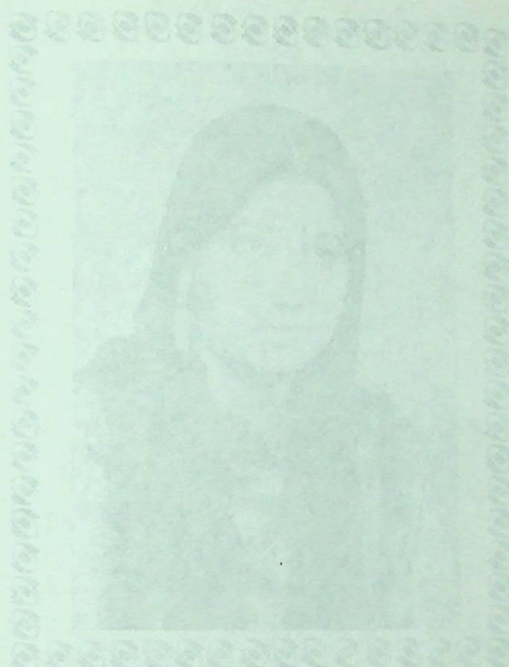


واجدہ تبسّم



The Author

Thanks for the financial Assistance to J & K, Academy of Art, Culture & Languages.



۱

ڈولتی نیّا

واجدہ تبسّم
(کشمیری)

کتاب :- ڈولتی نیا

مصنّفہ :- واجدہ تبسّم (کشمیری)

ناشر :- تبسّم ڈسٹری بیوٹرس نمائش گاہ روڈ بل مقابل ڈی۔ اے۔ وی سکول، سرینگر ۱۹۰۰۰۹ کشمیر

زیرِ اہتمام :- رضا رشید

تاریخ اشاعت :- دسمبر سنہ ۱۹۹۳ء

تعداد :- ایک ہزار

ٹائیٹل :- ملک الطاف احمد

کتابت :- معراج ترکوتی

طباعت :- میکا بٹ پرنٹرس سرینگر

قیمت :- ۲۵ روپے

تقسیم کار :-

سول ایجنٹ فون نمبر ۲۰۸۱ء

شیخ محمد عثمان اینڈ سنز رجسٹرڈ "تاجران کتب

ایکسچینج روڈ۔ گاؤکدل چوک سرینگر

۱۹۰۰۰۱ء

ترتیب

حرفِ ابتدا

خوابِ شیریں دیکھنے والے ہمیشہ تلخیٔ تعبیر میں مبتلا نظر آئے۔ دوسروں کے چہروں میں زندگی کی خوشی تلاش کرنا خود کو مغموم کرنا ثابت ہوا۔ پدری شفقت و مادری محبت کا جواب نہ مل سکا۔ نقل و اصل کی تمیز مٹ نہ سکی۔ نشاط و ملال کے نظریئے بدل نہ سکے۔ اُمید و یاس کا عروج و زوال، سکون واضطراب کا سلسلہ باقی رہا۔ پیمانۂ روز و شب بدستور گردش میں ہے اور تکمیلِ آرزو کی تشنگی ہنوز انسان کو کیف و کم کا دیوانہ بناتے ہوئے ہے۔ افسانے حقیقت کی تابناکی پیش کرنے سے مجبور۔

کچھ لوگوں نے غمِ دوراں کی عروسی کیفیت کو علمی جامہ پہنانا چاہا اور کچھ غمِ جاناں کے نگار خوش نمکیتیں کی پرستش میں لگ گئے۔ چند روزہ زندگی شاد و ناشاد گذارنا ہے گزارے جا رہے ہیں کیا زندگی کا مقصد و خلاصہ یہی ہے جو کچھ ہمارے سامنے ہے؟

"سمجھو تو کائنات کا حاصل ہے زندگی
سوچو تو اس سے بڑھ کے کوئی حادثہ نہیں"

غنچۂ اسلام کلب کامٹی (مہاراشٹر) کے آل انڈیا مشاعرہ میں لکھنؤ، دلی، جبلپور۔ حیدر آباد

بھوپال سے خوش فکر شعراء نے شرکت فرمائی۔ کشمیر سے محترم رضا رشید اور واجدہ تبسم بھی شریک ہوئے تھے۔ دونوں میاں بیوی (خدا انہیں خرم و شاد رکھے) بڑے شریف، نہایت خوش اخلاق اور شعر و سخن کے دلدادہ، نظم و نثر کی متانت و صلاحیت کے حامل و قائل نظر آئے۔

واجدہ کے افسانے کے کردار زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ وہ دکھانا چاہتی ہے کہ سماج کے ذمہ دار کتنے غافل، کتنے بے حس واقع ہوئے ہیں اور رنگ و نسل، حسب و نسب کے زنداں میں گرفتار ہیں۔ طبقۂ جواناں مرد و زن، فکر و احساس کے تپتے ہوئے صحرا میں بھٹک رہا ہے، روحانی، جسمانی تباہیوں کا مرکز بنا ہوا عشرتِ ماضی سے دور حال و مستقبل کے خوشگوار لمحات کا تقرب حاصل کرنے کیلئے سرگرداں ہے۔ واجدہ کے افسانے تصنع سے مبرا ہیں۔ وہ سیدھے سادے لفظوں میں اپنے ماضی الضمیر کو بیان کرنے میں درجۂ کمال تک پہنچ گئی ہے۔

واجدہ تبسم سے مستقبل کی تمنائیں وابستہ ہیں۔ مجھے امید ہے کہ نوجواں ادیبہ کا یہ پہلا مجموعہ دنیائے ادب میں مقبولیت پائے گا۔

شاطرؔ حکیمی
ڈاکٹر شیخ کالونی، کامٹی
ناگپور۔ مہاراشٹر

مورخہ ۱۱۔ مارچ ۸۰ء

پیش لفظ

واجدہ بیٹی سے اگرچہ ملاقات نہیں ہوئی ہے مگر خط وکتابت برابر ہوتی رہتی ہے۔ اُنھوں نے مجھے "ڈولتی نیا" کا مسودہ بھیج کر اس پر رائے لکھنے کی فرمائش کی۔ مُسودے کو پڑھ کر مجھے اپنے فیصلے کی اصابت میں شُبہ نہ رہا۔

"ڈولتی نیا" تیرہ ۱۳ افسانوں کا مجموعہ ہے ان میں سے بیشتر ہندوستان کے مختلف جرائد واخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔ میں نے افسانوں کو پڑھا اور چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اور کچھ دیر کے لیے سوچنے لگا۔ کیا واجدہ بیٹی آج کے دَور کی ایک نوجوان افسانہ نگار ہے یا اُس تحریک کی رُکن ہیں تحریک کا ادب زندگی کا ادب کہلاتا تھا۔۔۔ ان کی تخلیقات میں درد اور تڑپ ہے زندگی کی گہرائیوں پران کی گہری نظر ہے۔ وہ زمانے کی حرکت کو اچھی طرح سے دیکھتی ہے اور اُس کی ضرورت کو بیان کرتی ہے۔ وہ اس دَور کی سماجی حقائق کی باریک مُبصر ہے۔

واجدہ تبسم نے اپنے تاثرات کی روشنی میں زندگی کے نکات و رموز کا انکشاف کیا ہے اور اپنے خاص اسلوب سے زندگی کے حقائق کا اظہار سنجیدگی سے کیا ہے ان کو اپنے

آپ پر اعتماد ہے اسلئے وہ بڑے یقین کے ساتھ اپنے خیالات کو پیش کرتی ہے۔

"ڈولتی نیا" میں کئی سماجی اور معاشی اُلجھنوں کو اُدھیڑا گیا ہے۔ خاص موضوع لڑکی کے رشتے کی دقتیں اور جہیز کے مطالبے کے کچوکے ہیں۔ اس قسم کے موضوعات کو "نچلے اور متوسط" طبقے کی معاشرتی اور نفسیاتی پریشانیوں کے پس منظر میں اُجاگر کئے گئے ہیں۔

سماج کے رسم ورواج جب زندگی سے مغائیت چھین لیں تو ان رسم ورواج کو بدلنے کی ضرورت لاحق ہوجاتی ہے۔ واجدہ سماج کو بدلا ہوا دیکھنا چاہتی ہے۔ ترقی وارتقا کی راہ سے وہ ناہمواریوں کو مٹا دینا چاہتی ہے۔

واجدہ کو کہانی کا فن آتا ہے اور ان کے ہاں وادی کشمیر کی زندگی کا تنوع مشاہدہ موجود ہے اور اس سے نفسیاتی طور پر جذب کرتے اور پھر فکروفن کے سانچوں میں ڈھالنے کی قوت بھی۔ اس کے تجربات اور مشاہدات نے انہیں اس بڑے شعور سے ہم آہنگ کردیا۔ ایک عام قاری بھی ان کے افسانوں میں وقت کی بے راہ روی اور ذہنی کشمکش کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جس کی مثال آپ کو "ڈولتی نیا" میں نظر آئے گی۔

واجدہ بڑی حقیقت پسند ہے۔ زندگی کے حقائق سے آنکھیں چُرانا خواہ وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہوں، اس کی فطرت سے بعید ہے۔ زندگی کے متعلق ان کا نظریہ بڑا صالح اور صحت مندانہ ہے۔ اُنہوں نے ہر کہانی کے بنیادی کردار میں ایسی خصوصیت اُبھاری ہے کہ ہر قاری چونکے بغیر نہیں رہ سکتا۔

واجدہ ایک شیریں کلام شاعرہ بھی ہیں۔ اس لئے اُن کے افسانوں میں کہیں کہیں شعریت کی مٹھاس کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اگر انہوں نے دلی لگن، جذب، حوصلے، محنت اور اُپج سے کام لیا اور متواتر کام لیا تو مجھے یقین ہے ان کی فطری صلاحتیں اور بھی اُبھریں گی۔ اور ایک دن قدرِ اول کے افسانہ نگار ثابت ہوں گی۔ مجھے اُمید ہے کہ اُن کا یہ پہلا مختصر سا افسانوی مجموعہ دُنیائے ادب میں مقبولیت پائے گا۔

آذر عسکری

مظفر آباد — پاکستان

مورخہ اگست، سنہ ۱۹۸۰ء

تعارُف:-

واجدہ تبسّم سے اکثر مشاعروں میں مختصر مُلاقاتیں ہوئیں۔ مگر ہر بار اِس باوِقار، باسلیقہ، باادب شخصیت نے اپنے اندازِ فکر سے بے حد متاثر کیا۔

واجدہ تبسّم کی شاعری اور افسانہ نگاری میں کشمیر کی اُن حسین وادیوں کا حسین عکس شامل ہے۔ جہاں اُنھوں نے اپنا بچپن گذارا ہے۔ واجدہ تبسّم کے افسانے اور شاعری میں کشمیر کی ادبی اور تہذیبی قدروں کی نفاست، نزاکت اور شرافت محفوظ ہے۔

مجھے یقین ہے کہ واجدہ تبسّم کے افسانوں کا یہ پہلا مجموعہ "ڈولتی نیا" دنیائے ادب میں عزّت سے دیکھا جائیگا۔ اور اِسے قبولیت خواص و عام کا شرف حاصل ہوگا۔

ایم۔ اے۔ تمنّا جمالی، دہلوی، ۲۰ر جنوری ۸۳ء

"ڈولتی نیا" — میری نظر میں

"ڈولتی نیا" محترمہ واجدہ تبسم کے تیرہ (۱۳) افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ایک افسانہ نگار کے افسانوں میں دیکھنے اور جاننے کی یہ چیز ہوتی ہے کہ اُس نے وقت کے تقاضوں کو کس حد تک اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کی ہے اور اپنے دل کی دھڑکن کو قاری کے دل کی دھڑکن بنانے میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اگر اس کے افسانے وقت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور جسے پڑھ کر قاری یہ محسوس کرے کہ یہ اس کے دل کی آواز ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ افسانہ نگار اپنے فن کو پیش کرنے میں کامیاب ہے۔ میں علم و فن کے معاملے میں ایک طفل مکتب ہوں پھر بھی یہ بات ضرور کہہ سکتا ہوں کہ محترمہ واجدہ تبسم کے افسانے قاری کے ذہن میں چراغاں کر سکتے ہیں اور اُن کی آواز جو قاری کے لئے ایک نئی آواز ہے یقیناً قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ ان کے افسانے ہماری زندگی میں رونما ہونے والے واقعات سے بالکل قریب ہیں یا یوں کہئے کہ

"جو سُنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے۔"

واجدہ تبسم کشمیر کی ایک نوجوان اور اُبھرتی ہوئی شاعرہ کے علاوہ ایک بالغ نگاہ اور

باصلاحیت، افسانہ نگار بھی ہیں۔ جنوری ۸۰ء کے آخری عشرہ میں وہ آرڈننس فیکٹری آنبہ جھری ناگپور کامٹی اور چاندہ کے مشاعروں میں شریک ہوئی تھیں۔ اسی دوران کامٹی میں ایک نشست میں اُنہیں بحیثیت ایک افسانہ نگار بھی سُننے کا اتفاق ہوا۔ ایک ذی ہوش شاعرہ ہونے کا ثبوت تو وہ مشاعروں کے علاوہ ملک کے معتدد رسائل وجرائد کے ذریعے دی چکی ہیں لیکن وہ ایک بہترین افسانہ نگار بھی ہیں۔ یہ جان کر اور بھی خوشی ہوئی۔ توقع ہے "ڈولتی نیا" محترمہ واجدہ تبسّم کو افسانوں کی دنیا میں ایک باوقار مقام سے سرفراز فرمائے گا۔ ایک بات اور جو اُن کے افسانوں میں مجھے نظر آئی وہ یہ ہے کہ اُن کے سامنے جو بھی چیز ہے اور جیسی بھی ہے واضح ہے اور اسی لئے انہوں نے غیر ضروری تشبیہات اور استعارات کا سہارا نہیں لیا ہے۔ یہ اُن کے تربیت یافتہ ذہن کا ثبوت ہے۔

محترمہ واجدہ تبسّم جیسا کہ میں نے اُنہیں دیکھا ہے اخلاق اور شرافت کا بہترین نمونہ ہیں اور اسی لئے اُن کے افسانوی کردار بھی تصنّع اور بناوٹ سے پاک ہیں ؎

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

نیازمند

فضیل انجم

ڈاکٹر شیخ کالونی کامٹی

"مہاراشٹر"

مورخہ ۷، فروری ۸۰ء

"آئینۂ خیال"

واجدہ تبسم جتنی اچھی شاعرہ ہے اتنی ہی اچھی افسانہ نگار بھی۔ میں نے کئی ایک افسانوں کو پڑھا ہے اور اُن کے ہر ایک افسانے کا موضوع جُدا پایا۔ کہیں پر معاشرتی برائیوں کو پیش کیا ہے تو کہیں پر معاشی حالات کو ہمارے (قاری کے) سامنے کھڑا کیا ہے۔ اُن کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری خود کو اُسی افسانوی ماحول کا ایک فرد محسوس کرتا ہے اور یہی خوبی افسانے کی انفرادیت ہے۔

واجدہ صاحبہ نے افسانے کے فن کو اُس کے روایتی انداز تک ہی محدود نہیں رکھا۔ بلکہ بعض افسانوں میں اپنے مشاہدات و ذاتی شعور و فکر کے ذریعہ ایک نیا روپ عطا کیا ہے۔ اور اپنے اس دور کے مسائل و تقاضوں کا ترجمان بنایا۔ ہندوستان کے جنتِ بے نظیر مقام کشمیر کی یہ افسانہ نگار کے بعض افسانوں میں جان لیوا چھوٹے چھوٹے فقرے صوتی آہنگ اور موسیقی کے ساتھ جھرنوں کی سی روانی سے بہتے ہیں۔ اور یہی جھرنے بہتے بہتے راستے کے چھوٹے بڑے پتھروں سے ٹکراتے بھی ہیں اور انہیں جھنجھوڑ کر آگے بڑھا جاتے ہیں۔

واجدہ صاحبہ کا اسلوب بہت ہی سادہ ہے جس طرح خود ہیں اور

اُسی طرح افسانوں میں شُستہ زبان اور الفاظ نہایت ہی جچے تلے استعمال کرتی ہیں۔ بیان میں روانی اُن کی خصوصیت ہے اور یہی تخلیق کار کے اسلوب کی سادگی مطالعہ سے اُنسیت پیدا کرتی ہے۔

واجدہ تبسم سے میری پہلی ملاقات ناگپور میں ہوئی اور مسلسل ہم نے ایک ساتھ تین کُل ہند مشاعروں میں حصہ لیا۔ واجدہ صاحبہ کے افسانے ہی نہیں اُن کی غزلیں اور نظمیں بھی بہت معیاری ہیں۔ طبیعت میں بڑی سادگی ہے۔ جس طرح "موگرہ" اپنی خوشبو سے سارے چمن کو معطر کرتا ہے۔ اُسی طرح واجدہ اپنے افسانوں اور غزلوں و نظموں کے ذریعے ادبی محفل کو معطر کرتی ہیں۔ "موگرہ" اپنے تقدس کے لئے مشہور ہے۔ اسی طرح واجدہ تبسم کو دیکھتے ہی ذہن میں "موگرے کے پھول" کا تصور اُبھر آتا ہے۔

مجموعہ کا نام "ڈولتی نیا" بہت ہی پسند آیا۔ میں کیا، میری شاعری کیا اور میرا پیام کیا ــــــــــــــــــــ

خُدائے بُزرگ و برتر سے دُعا گو ہوں کہ واجدہ صاحبہ کو ہمیشہ خوش اور صاحب ایمان رکھے۔ اور اُن کے نقشِ اولین "ڈولتی نیا" کو شہرت بخشے۔ آمین۔ اور مزید کئی ایک شعری اور افسانوی مجموعے نکالنے کی سعادت اور ہمت بخشے۔

بس ــــــ نیک تمناؤں کے ساتھ

دُعا گو

ڈھکن رائچوری

مورخہ ۱۶ مارچ ۱۹۸۰ء

عرضِ مُصنّف

بسم اللہ :-

قارئینِ کرام ! "ڈولتی نیا" میرے مختصر افسانوں کا انتخاب آپ کے ہاتھوں ہے۔ اس سے قبل کہ آپ اس کتاب کا باقاعدہ مطالعہ شروع کریں، چند باتیں اپنے اور اپنی اِس تخلیق کے متعلق عرض کرنا چاہتی ہوں۔ یہ میرا اپنا خیال ہے کہ تمہیداً اپنے اور تخلیق کے سلسلے میں کہنا اُس خاص قسم کے رشتے کو اُستوار کرنا ہے جو افسانہ نگار یا مُصنّف اور قاری کے درمیان مطالعے کے دوران خود بخود پیدا ہو جاتا ہے، علاوہ ازیں افسانہ و تحریر کے ذریعے مُصنّف کے مافی الضمیر کو سمجھنے میں قاری کو مدد حاصل ہوتی ہے۔

کم سنی میں مجھے ریڈیو سُننے کا جنوں کی حد تک شوق تھا، اور اسی جنون یا شوق کے اکسانے پر میں بہت جلد ہی ریڈیو سے وقتاً فوقتاً نشر ہونے والے بچوں کے پروگرام میں شریک ہونے لگی۔ یہ پروگرام میرے ذوق و شوق کے لئے مہمیز ثابت ہوئے۔ اور طالبِ علمی کے زمانے ہی میں لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع کر دیا، ساتھ ساتھ مباحثوں مذاکروں میں بڑے جوش و خروش سے حصّہ لینے لگی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت میں نے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا۔ اس کے باوجود

شوق کا یہ عالم تھا کہ ایسے مواقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھی، فرصت تو تھی ہی، سارا وقت پڑھنے لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔

وقت گزرتا گیا، اور وقت کے ساتھ ساتھ میرا شوق بھی پروان چڑھتا رہا۔ جب میں نے دسویں جماعت میں داخلہ لیا تو اُس وقت مجھے ایک بزرگ اُستاد کی رہنمائی حاصل ہوئی جو اُردو کے مُعلّم تھے۔ جب بھی کوئی مضمون، افسانہ، نظم یا غزل تخلیق ہوتی تو اُن سے مشورہ و صلاح کی طالب ہوتی۔ مشفق و خلیق اُستاد میری تحریر کو بڑی توجہ بڑے غور و فکر سے دیکھتے اور بہتر مشورہ دیتے اور میں اُن بے بہا مشوروں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی تحریروں کو سنوارنے اور نکھارنے کی کوشش کرتی۔ اُستاد کی توجہ اور اپنی لگن سے مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ کمزوریوں تک نظر پہنچی اور خوب و زشت کی پہچان ہوئی۔ اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا جب مجھے میرے خوابوں کی تعبیر مل گئی۔ میرے افسانے، میری غزلیں اور نظمیں مُلک کے مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہوتے گئے۔ میری تخلیقات کو قارئین نے سراہا۔ پسند کیا اور ہند و پاک سے ڈھیر سارے مبارک باد کے خطوط موصول ہونے لگے۔ میری صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کالج کے اُردو میگزین سیکشن کی ایڈیٹر منتخب کیا گیا۔ علاوہ ازیں کالج بیس پر ہونے والے اکثر و بیشتر علمی و ادبی مقابلوں اور مباحثوں کی نمائندگی بھی مجھے سونپی گئی۔ اس طرح مجھے اپنی اُس خامی کو دُور کرنے کا موقع حاصل ہوا۔ جس کی نشاندہی بہت پہلے اُستادِ محترم نے فرمائی تھی۔ اُستادِ محترم کے خیال کے مطابق میری تحریر و تقریر میں مطابقت و ہم آہنگی کی کمی تھی اور کبھی کبھی مجھ میں دو شخصیتوں کا پرتو جھلکنے لگتا تھا۔ شروع شروع میں یہ بات میں نے پوری طرح محسوس نہیں کی۔ یا یوں کہیے کہ پوری طرح پلّے نہیں پڑی لیکن جب مباحثوں اور مقابلوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا تو رفتہ رفتہ مجھے اپنی اس خامی کا احساس ہونے لگا اور میں نے جلد ہی اس خامی یا کمزوری سے نجات پالیا۔ اس کا عکس "ڈولتی ناؤ" میں نظر آئیگا۔

پر وہ قاری جو اُردو ادب کی تاریخ سے تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتا ہے، جانتا ہے کہ جس طرح اُردو شاعری کے ڈانڈے فارسی شاعری سے ملتے ہیں، اسی طرح اُردو ادب میں افسانہ مغرب کی دین ہے، پریم چند، کرشن چندر کے علاوہ سینکڑوں اُردو ادیبوں نے افسانہ نگاری کے چمن کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی ہے اور اس صنف کو خوب سے خوب تر بنانے میں اپنے شب و روز ایک کر دیتے ہیں۔ اور یہ اُنہی جگرداروں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج اُردو افسانہ اور تکنیک کو عالمی ادب میں ایک مقام حاصل ہو چکا ہے۔ اُردو افسانہ فنونِ لطیفہ کی وہ قسم ہے جس کے ذریعے صرف تسکینِ ذوق ہی نہیں ہوتی بلکہ سماجی فلاح و بہبود کے فرائض بھی انجام پاتے ہیں۔

اُردو ہندو مُسلم اتحاد کی ایسی کڑی ہے جسے اختلافات کے تیشے توڑ نہیں سکتے۔ پھر کشمیر "جنتِ ارضی" اس اتحاد، اس یکتا کی جیتی جاگتی روشن دلیل و علامت ہے اسی لئے اُردو زبان کو یہاں سرکاری زبان ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اِس سلسلے میں اُن دانشوروں، قلمکاروں کو فراموش کر دینا احسان فراموشی کے مصداق ہوگا۔ جنہوں نے کشمیر میں کڑے سے کڑے وقت میں بھی اُردو کو اپنے سینے سے لگا رکھا اور بیش بہا خدمات بھی انجام دیں۔ مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِدھر ایک صدی سے زاید عرصہ بیشتر فنکار اور تخلیق کار اُردو زبان کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔

"ڈولتی دنیا" کی تخلیق میں بھی اُردو زبان کی خدمت کا جذبہ کارفرما ہے۔ اللہ کرے میرا یہ جذبۂ خلوص کام آئے اور اس سے اُردو زبان کی ترقی و ترویج ہو۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ہندو پاک سے ناشرین نے "ڈولتی دنیا" کے افسانوں کو دوسری زبانوں میں ترجمے کرنے کے لئے اجازت نامے طلب کئے ہیں۔ یہاں ایک بات جسے میں بہت زیادہ اہم سمجھتی ہوں وہ یہ کہ افسانوی مطالعہ کے دوران مجھے یہ شدت سے احساس ہوا کہ اِدھر گذشتہ کچھ سالوں

سے جو افسانے کشمیر کے پس منظر میں لکھے جا رہے ہیں۔ دانستہ نادانستہ طور پر کشمیری روایتی تمدنی اور تہذیبی قدروں کو پامال و مجروح کیا جا رہا ہے۔ یہ میرے لئے نہایت دکھ اور رنج کی بات ہے کہ سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے کسی خطّہ کی پاکیزہ روایت کو مجروح کیا ہے۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ ادیب کا فرض حقائق کی ترجمانی کرنا ہے۔ لیکن اس میں جس جانبداری کی ضرورت ہے وہ نظر نہیں۔ برخلاف اس کے حقائق تو الگ رہے دروغ بیانی سے بھی کام لیا جا رہا ہے جو یقینی طور پر قارئین کی ذہنی رَو کو غلط سمت پھیرے جا رہی ہے۔ "ڈولتی نیا" میں میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ میرا قلم اس "ادبی بدعت" سے محفوظ رہے۔

"ڈولتی نیا" کے ذریعے اپنے خیالات و جذبات۔ تجربات و مشاہدات کا کہاں تک اور کس خوبی سے اظہار کر سکی ہوں۔ اس احتساب کی ذمہ داری میں اپنے قارئین اور ناقدین کو سونپتی ہوں۔

یہ بڑی ناشکر گزاری ہوگی کہ میں اُن کرم فرما حضرات کا شکریہ ادا نہ کروں جن کی معاونت و عنایات نے میرے اس انتخاب کی تدوین و ترتیب میں آسانیاں پیدا کیں۔ جس سے میری حوصلہ افزائی ہوئی۔

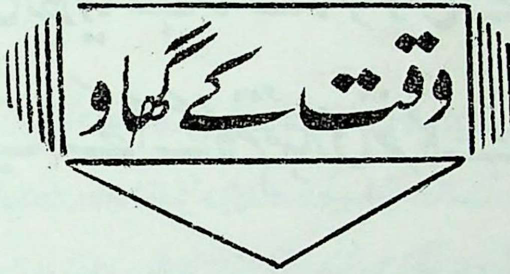
جہاں "ڈولتی نیا" کی اشاعت پر خوشی ہے وہاں یہ افسوس بھی ہے کہ صلاح و مشوروں کے دوران جن مخلص صاحبان نے تعریفی، اصلاحی خطوط روانہ کئے تھے۔ اُنہیں اس ایڈیشن میں کوئی جگہ نہ مل سکی۔ انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں یہ کمی پوری ہو جائے گی۔ فی الحال اپنے اُن ہمدردوں سے معذرت خواہ ہوں۔

اخلاق کیش

واجدہ تبسم (کشمیری)

دِل رکھ دیا ہے سامنے لاکر خلوص سے
اب اِسکے آگے کام تمُہاری نظر کا ہے!

"حضرت جگر مراد آبادی"


وقت کے گھاؤ

زندگی کے رنگ بھی عجیب ہیں، یہ کس قدر حسین نظر آتی ہے، اس کا بانکپن اس کی رعنائی ہر دیدہ بینا کو دعوتِ نظر دیتی ہے۔ مگر اس کی کوکھ میں جنم لینے والے ہزاروں دُکھ، پھول کے سائے میں پنپنے والے لاکھوں خار ـــــ کبھی دھوپ تو کبھی چھاؤں۔ کس قدر بے وفا ہے یہ زندگی اور کتنے روپ ہیں اس سنسار کے۔

زندگی خواب ہے۔ ہاں ـ خواب! جو چاہے کتنے ہی حسین کیوں نہ ہوں۔ پھر بھی خواب ہی کہلاتے ہیں۔ حقیقت سے کوسوں دُور ـــــ خوابوں کے جال ٹوٹتے دیر نہیں لگتی۔ اور جب حقیقت کے چہرے سے پردہ سرک جاتا ہے۔ تو انسان خوابوں کی دُنیا سے نکل تو جاتا ہے مگر مایوس ہو کر ـــــ

ابھی چند ہی لمحوں پہلے میں ایک کتاب کے مطالعے میں مشغول تھی کہ مجھے روحی یاد آگئی۔ وہ میری بچپن کی سہیلی، میری ہم درس، میری چہیتی ہمجولی ـــ کس قدر ذہین تھی وہ۔ مگر بدنصیب۔ جس لڑکی کے سر سے ماں کا سایہ بچپن ہی میں اُٹھ جائے اور باپ پہلے ہی داغِ یتیمی دے چکا ہو ـــ وہ کہاں جائے؟ ـــــ جب کہ روحی کا نہ کوئی بھائی تھا نہ بہن ـــــ ابھی وہ چوتھی جماعت ہی میں پڑھ رہی تھی کہ اُس کے ناز اٹھانے والی ماں کی شفقت بھی موت کے بے رحم ہاتھوں نے چھین لی۔ اور بیچاری کمسن لڑکی کو سر چھپانے ، جگہ نہ رہی ـــ کبھی چچا کی عاطفت کا سہارا لیا تو کبھی ماموں کا ـــ لیکن

کون ہے جو بن باپ کی بچی کو ماں کا پیار اور باپ کی محبت دے سکتا۔ روحی اکیلی، اس وسیع کائنات میں اس بھری خدائی میں بے یار و مددگار بیکس و تنہا رہ گئی۔ زندگی کے سمندر میں ڈوبتی اُبھرتی ساحل کی تلاش میں موجوں اور تھپیڑوں کے رحم و کرم پر جیتی رہی۔

دن گزرتے گئے۔ روحی نے لڑکپن کے رسیلے دَور میں قدم رکھا۔ اب وہ سمجھنے لگی تھی کہ دنیا میں اُس کا کوئی نہیں۔ وہ میری ہمسایہ بھی مگر اپنی بیکسی کے احساس نے اُسے مجھ سے بھی دُور دُور رکھا۔ اکثر مہینوں مجھ سے ملنے بھی نہیں آتی تھی۔

وہ اکثر خاموش رہتی، پھٹے پرانے سیدھے سادے لباس سے اُس کی شرافت افلاس اور بے نیازی جھلکتی تھی۔ وہ کبھی دروازے یا کھڑکی پر دکھائی نہ دیتی اور نہ ہی اُس کی آواز ہمسایہ سُن سکتے۔ یہاں تک کہ جوانی کے قوسِ قزح میں داخل ہوئی۔ بے فکری کے دن بیچاری کو پہلے بھی کم ملے تھے مگر اب حیا، لاچاری اور بے چارگی نے اُس کے ذہن و شعور پر زیادہ دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ اگر پہلے کبھی معصومیت اور بھولے پن سے اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل جاتی لیکن اب وہ ہمیشہ خاموش، مُہر بہ لب، کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ ایک یتیم اور بے آسرا لڑکی جب جوان ہو جائے تو اُس پر قیامت کیوں نہ ٹوٹے۔ وہ اکثر تنہائی میں روتی رہتی ——

ہمارے محلے میں ساتھ ہی ایک سلائی سنٹر تھا۔ جہاں لڑکیوں کو سلائی اور بُنائی وغیرہ کا کام سکھایا جاتا تھا۔ مستحق ذہین بچیوں کو کچھ وظیفہ بھی سرکار کی طرف سے ملتا تھا۔ روحی کے ماموں نے اس کو اس سنٹر میں داخل کرا دیا۔ سلائی کا ہنر سیکھنے یا وظیفہ کے چند روپلوں کی لالچ سے۔ روحی نے دل لگا کر سلائی کا کام سیکھا۔ اور جب اُسے وظیفہ کی رقم ملی تو خوشی خوشی لا کر اپنے ماموں کو دیتی رہی۔ اور ماموں اپنی یتیم بھانجی کی سعادت مندی سمجھ کر اس رقم کو گھر کے مصرف میں لاتا رہا۔

روحی نے اپنی محنت اور فطری صلاحیت سے بہت جلد سلائی کے فن میں پوری مہارت حاصل کر لی

اور تمام زیرِ تربیت طالبات سے زیادہ ممتاز حیثیت میں امتحان پاس کر لیا۔ اس کی کارکردگی اور ذوق و شوق سے متاثر ہو کر جلدی ہی روحی کو سلائی سکھانے کے لئے ملازم رکھ لیا گیا۔

اب محتاجی اور فاقہ کشی سے نجات حاصل کرنے اور ذرا آرام سے گزر بسر کرنے کا ایک وسیلہ مل گیا تو اُس نے خدائے عزّ و جل کا شکر ادا کیا ______

وہ مجبور تھی۔ اُس کا عزم راسخ تھا۔ اس کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئی۔ وہ زندگی کے اس سفر میں سنسان اور پُر خطر راہوں پر چلتی رہی۔ شاید یہ اُمید لے کر کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا۔ جب گلشنِ حیات کی سوکھی ہوئی ٹہنیوں میں نئی کونپلیں پھوٹ نکلیں گی اور زندگی کے تاریک راستے پھر سے روشن ہو جائیں گے۔

آج اُسے وہ دن یاد آ رہے تھے۔ جب وہ دو دو دن بعد کچھ روکھی سوکھی کھاتی، دنوں بے آب و دانہ گزر جاتے اور اس کے لب گلہ یا شکوہ سے آلودہ نہ ہوتے۔ مگر اب دن پھر گئے تھے وہ اُستانی بن گئی تھی۔ سماج میں اس کا احترام تھا۔ اور وہ کسی کے رحم و کرم پر دن گزارنے کے لئے مجبور نہ تھی۔

روحی کا بھرپور شباب اس کے اچھوتے ارمان اُس کے انگ انگ سے ٹپکنے لگے۔ اور اب وہ ذرا بن سنور کر نکلنے لگی۔ تو اس کے حُسن میں نکھار سا آنے لگا۔ وہ پاکیزہ فطرت اور نیک سیرت لڑکی تھی اور زندگی کے اُس موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ جہاں ہر لڑکی اپنے مستقبل کے خواب دیکھتی اور کسی رنگین سہارے کی آس لگانے لگتی ہے۔

اُس نے اب کچھ روپے جمع کر لئے تھے اور جوڑی ہوئی رقم سے کچھ کپڑے کچھ زیور وغیرہ بنا لئے تھے۔ وہ اپنے گھر کو اب سجانے سنوارنے کی طرف بھی دھیان دیتی۔ سلیقہ مندی اور کفایت شعاری سے اُس نے اپنے ہمسایوں اور ہم چشموں میں کافی عزت حاصل کر لی تھی۔

لیکن افسوس کہ اس کو سچا قدردان نہ ملا۔ اُس کے ماموں نے روحی کی شادی ایک بدچلن

اور ان پڑھ گنوار سے کردی۔ اس نے روحی کے ارمانوں کو بڑی بیدردی سے پامال کردیا۔ وہ روحی کی تنخواہ پہلی ہی تاریخ کو اس سے چھین لیتا اور شراب اور جوئے میں برباد کر کے سارے مہینے وفا شعار بیوی کو ترساتا۔ وہ نکما اور بدمزاج تھا۔ روحی سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ اُس نے کبھی لب نہ ہلائے۔ کبھی آہ تک نہ کی۔ ایک مجبور اور بے لبس عورت کی طرح اپنے آپ کو سنبھالتی رہی۔ وہ اب گھر پر بھی کپڑوں کی سلائی کا کام کرنے لگی تاکہ گھر کی ضروریات کے لئے کچھ اور کما سکے۔

ایک دن روحی کے شوہر کو نہ معلوم کیا سوجھی کہ اُس نے روحی کو نوکری چھوڑ دینے پر مجبور کیا۔ اُس کی پارسائی اور پاکدامنی پر الزام لگانے شروع کئے۔ اس کی مار پیٹ شروع کی۔ روحی جو پہلے ہی ہزاروں جبر کے کھا چکی تھی روز روز کی تلخ کلامیوں سے تنگ آگئی اور باوجود انتہائی ضرورت کے اُس نے ملازمت ترک کردی اور صرف گھریلو محنت و مشقت پر انحصار کو کافی سمجھ لیا۔

دن گزرتے گئے۔ انور حسبِ معمول شراب کے نشے میں چور رات گئے تک باہر رہتا اور روحی دن بھر کے کام کاج اور سلائی کی محنت سے تھکی ماندی اسی کی راہ دیکھتی رہتی۔

روحی کے پاس ماں کا زیور تھا۔ اُس نے خود بھی کچھ بنایا تھا۔ اور کچھ شادی کے دن انور کے والدین نے بھی دیا تھا ——— ایک روز انور نے تمام زیورات لیکر فروخت کردیئے اور روحی کو اس کے ماموں کے پاس چھوڑ کر وہ کسی اور شہر میں چلا گیا۔ روحی نے لاکھ سمجھایا۔ روئی دھوئی مگر ضدی شوہر کے سامنے اس کی کچھ نہ چلی ۔ وہ اکیلی رہ گئی۔ اُس کی اُمیدوں کا سورج بدلیوں میں چھپ گیا۔ انتظار کی مالا ٹوٹ گئی۔ روحی ایک چاندسی بے بی کی ماں بن گئی۔

روحی کا ماضی ویران گزرا تھا۔ وہ نہیں چاہتی کہ اُس کی پارۂ جگر بیٹی بھی ایسی ہی زندگی بسر کرے۔ انور کے گھر والوں نے جب یہ خبر سُنی۔ کہ اُن کی بہو نے ایک لڑکی کو جنم دیا۔ تو اُنہوں نے کہلا بھجا کہ "یہ ہماری بہو نہیں ہے۔ ہمارا لڑکا یہاں نہیں ہے۔ ہم اس کو کیا کریں گے ———"

انور کے گھر والوں کو لڑکی کی پیدائش ناگوار ہوئی۔

روحی نے سسرال والوں کی یہ دل شکن باتیں سنیں تو اس کا دل جو پہلے ہی غموں سے نڈھال تھا اب اور غم کا بار برداشت نہ کر سکا۔ دو تین دن وہ اسی طرح درد و کرب میں تڑپتی رہی، روتی رہی، آہیں بھرتی رہی اور کسی نے آکر اس کو پوچھا تک نہیں۔ آخر کار عمر بھر کی بیقراری کو قرار آہی گیا۔ اور روحی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چپ ہو گئی۔

ننھی سی جان اپنی ماں کی لاش پر بلکتی اور چلاتی رہی۔ تو روحی کی ممانی اور ماموں کو پتہ چلا کہ وہ دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔ اس کی تجہیز و تکفین کے بعد اس منحوس شیر خوار کو گھر سے نکالنے کے منصوبے بنائے جانے لگے تاکہ روحی کے والدین کی میراث پر بلا شرکت غیر سے ان کا قبضہ ہو جائے۔

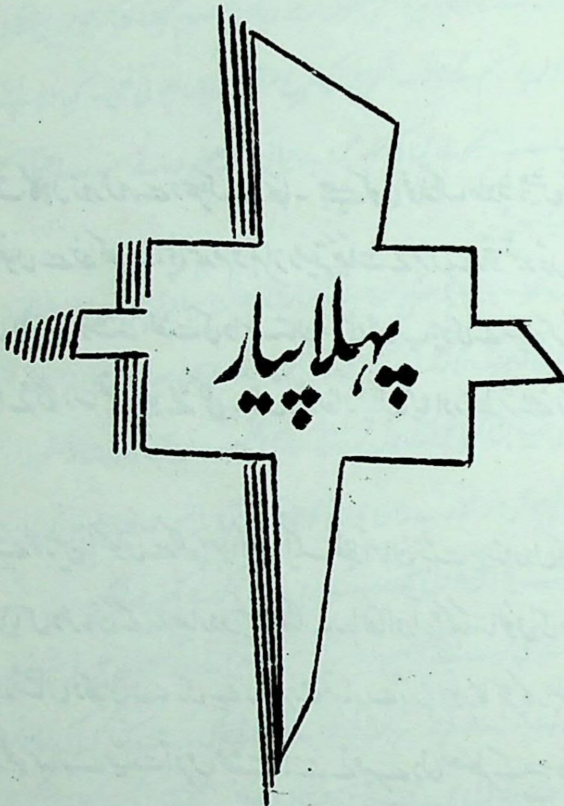
اتفاقاً محلے میں ایک شادی شدہ جوڑا پندرہ برس سے کسی ننھے منے کی ہمک اور اٹھکھیلوں کی حسرت میں بہت ہی بے کیف اور مایوس دن گزار رہا تھا۔ روحی کے ماموں نے غنیمت جان کر مرحوم روحی کی ننھی منی بے بی کو ان کے حوالے کر دیا۔

کچھ عرصہ بعد انور ایک کالی کلوٹی لڑکی کو بیاہ کر ساتھ لایا۔ جو بہت بد سلیقہ، منہ پھٹ اور بدصورت تھی۔ وہ یہاں کی تہذیب و معاشرت سے ناواقف اور محلہ والوں کے لئے بھی ایک عجوبہ بنی۔ لیکن انور کے والدین نے اسی کو احترام اور پیار سے نوازا۔

انور نے نہ کبھی روحی کو یاد کیا اور نہ اپنی بیٹی کو کبھی دیکھنے کی زحمت گوارا کی۔ بے بی بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ بڑے ناز و ادا سے اس کی پرورش ہو رہی تھی۔ وہ اپنے والدین کی آنکھوں کا تارا اور جگر کی ٹھنڈک تھی۔ اس کو وہ سب میسر تھا جو ایک خوشحال اور فارغ البال کنبے کی لاڈلی بیٹی کو ملنا چاہیے۔

انور خود دو بیٹیوں کا باپ بن چکا تھا۔ اس کو اب اس بے بسی کے عالم میں کبھی کبھی

پرانی یاد دل کے ویران گوشوں سے اُبھر کر بیقرار کرنے لگی۔ خیالوں میں روحی کے پُر خلوص مشورے اُس کا ایثار ضبط و صبر اور نامساعد حالات میں روحی کا حوصلہ ــــــــ وہ کبھی تڑپ جاتا اور کبھی اُس کے دل میں کرب و اضطراب سا پیدا ہوتا۔ اُس کا ضمیر بار بار اُس کو ملامت کرتا اور وہ اپنے ماضی کے گھناؤنے کرتوت پر خود شرمسار رہتا۔ اب اگرچہ وہ اپنی پسند کی بیوی کے ساتھ دن گزار رہا تھا مگر اُس کی رُوح کسی نامعلوم اضطرار اور اضطراب کے باعث بے قرار ہوتی اور وہ اندھیرے مُنہ گھر سے نکل کر روحی کی قبر پر پہنچتا سر ٹکراتا اور آنسوؤں کے موتی مزار پر چڑھاتا۔ مگر اب یہ سب کچھ بے سود اور بے معنی تھا ــــــــ


پہلا پیار

عارف کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے کوئی خوفناک حادثہ پیش آنے والا ہو۔
اُس نے لرزتے ہاتھوں سے خط کھولا۔ اپنی ہمدم و ہمراز رفیقۂ حیات کے پرس سے خوشبوؤں میں بسا ہوا
ایک محبت نامہ، کسی اور سے رشتۂ اُلفت کی داستان، اپنی محبوب بیوی کے سیاہ کرتوت کا دستاویزی
ثبوت۔ سر چکرانے لگا، سانس پھولنے لگی۔ اس نے لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنے لگا۔

جانِ وفا!

تمہارے نازنین ہاتھوں سے لکھا ہوا ایک ایک لفظ آسمانِ محبت پر ستاروں کی طرح جگمگاتا
نظر آیا۔ کل تک میں یاس و حرمان کے اندھیاروں میں بھٹک رہا تھا اور آج کہکشانوں کی روشنی سے
ساری فضا تاباں و درخشاں دکھائی دے رہی ہے۔ ہر طرف تمہارے رُخِ انور کا سحر کار جلوہ نظر آرہا ہے۔
یقین رکھو تمہارے حیات آفرین مُحبت نامے نے میرے دلِ مضطر کے ساتھ وہی سلوک
کیا جو ابرِ گوہر بار کے قطرات، آفتابِ عالمتاب کی بے رحم شعاعوں سے جھلسے ہوئے پژمردہ پھولوں
کے ساتھ کرتے ہیں۔
تمہاری عنایتوں اور مرحمتوں کی اُمید میں آنکھیں فرشِ راہ کیے منتظر ہوں۔

طالبِ دیدار

یوسف

ہوا کے تیز جھونکوں میں ہلتے ہوئے سرسبز پتوں کی طرح اُس کے کانپتے ہاتھوں میں وہ خط لرز رہا تھا۔ عارف کو ساری دُنیا گھومتی ہوئی معلوم ہوئی، جیسے زمین اس کے پاؤں تلے کھسک رہی ہو۔

ہاجرہ! جسے میں حوروں سے زیادہ پاکیزہ، فرشتوں سے زیادہ معصوم سمجھتا تھا۔ جو میری نظروں میں چاند کی نورانی فضا اور پھولوں پر شبنم کے نازک قطروں کی طرح مقدس اور اچھوتی تھی۔ کیا وہ اپنے دامن میں عصیاں کے داغ چھپائے اپنے بھولے پن کی تہہ میں بے حیائی کے لچھن دبائے، میرے اعتماد کے آبگینے کو ٹھیس پہنچاتی رہی ہے۔؟

فیصلہ مشکل تھا۔ ہاجرہ جو سراپا خدمت گزاری، جاں سپاری اور بے لوث محبت وایثار کا مجسمہ بنی ایک سال سے عارف کی زندگی کے ویران چٹیل میدان میں بہاروں کی فرحت افروز فضا اور مسرتوں کی پُر رونق دنیا بن کر اس کے دِل پر راج کر رہی تھی۔ اس کے عادات واطوار، اس کا پُرخلوص جذبۂ اُلفت اُس کے پاکیزہ کردار اور بے داغ جوانی کا ناقابلِ تردید ثبوت تھا۔ جس کو عارف آزماتا رہا تھا۔ لیکن پھر یہ خط ـــ؟ اس کا دل تذبذب کی لہروں میں ہچکولے کھانے لگا۔

اتنے میں ہاجرہ چائے کی ٹرے لئے معصومانہ انداز میں مسکراتے، آنکھوں میں فرشتوں جیسا پاکیزہ تبسم چھپائے، بڑے ناز سے اپنے سرتاج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جیسے کہ اُس کی تمام تمناؤں کا مرکز بس وہی ہو۔ لیکن عارف کے دل میں ایک آتش فشاں بھڑک رہا تھا۔ اُس نے زندگی میں پہلی بار مشکوک نظروں سے اُس کے سراپا کا جائزہ لیا اور تجسس آمیز نظر اس کے چہرے پر ڈالی تاکہ اس کے دل کے پردوں میں چھپی ہوئی کسی شرارت کا پتہ لگا سکے لیکن اس کا چہرہ ایک کھُلی کتاب تھی جس کو ہر دیدہ بینا دیکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ گلِ صحرا ہے جس کے دامن تک کبھی ہواؤں کی شوخی نے بھی رسائی نہ پائی ہو۔ اس کے انگ انگ سے عفت وعصمت کی نورانی جھلک اپنے پورے جلال وجمال سے جلوہ گر تھی۔ وہ مریم و سیتا سے زیادہ مقدس اور معصوم لگ رہی تھی اور اس کی چال ڈھال اس کی گفتار

نہ کبھی بات پر تصنع کی ملمع کاری کا شائبہ تک دکھائی نہ دیتا تھا۔

ہاجرہ نہ سمجھی کہ عارف کی نگاہیں اس کے حسن و شباب کو خراجِ تحسین پیش کر رہی ہیں یا اب اس کے پرستار کے دل میں شک کا روگ لگ گیا ہے۔ اور وہ کسی اور نظر سے تاک رہا ہے۔ وہ ایک نگاہ غلط انداز جس میں ناز بھی تھا نیاز بھی، کیف و مستی بکھیرتی ہوئی الٹے قدم لوٹی تاکہ عارف کے لئے ناشتہ تیار کر کے جلدی ہی آجائے۔

شام کا وقت تھا۔ دن اور رات کی ہم آغوشی سے دلوں پر کیف و انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ ہوا میں مستی تھی۔ سرور تھا۔ جذبات میں عجیب گدگدی سی پیدا ہونے لگی۔ فاختہ کا جوڑا ننھے ننھے پنکھوں میں اپنے آشیانے کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ سرمئی شام کے بھیگے بھیگے ماحول میں وہ اپنی ڈیوٹی سے گھر لوٹا تھا۔ لیکن اس کے سینے میں ایک جوالا مکھی سا پھٹنے والا تھا۔ دن چھپ گیا اور عارف شام کا کھانا کھانے بیٹھا تو ہاجرہ پر اپنے دل کے کرب کو ظاہر ہونے نہیں دیا اور دو چار لقمے زہر مار کر کے اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ اداسی کے عالم میں بسترِ غم پر کروٹیں بدلتا رہا۔ سارے دن کا متلاطم ہیجان اُسے نیم بسمل بنا چکا تھا اور اب جوں جوں سیاہی پھیل رہی تھی۔ ہاجرہ اپنے گھر کے معمول کا کام جلدی جلدی سمیٹ کر آنے والی تھی مگر ایک ایک لمحہ عارف پر بھاری نظر آرہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہاجرہ کو یہ خط دکھائے اور اُس سے وہ سارے راز اگلوائے جو وہ اپنے مکردہ سینے کے گوشے میں نہ معلوم کب سے دبائے بیٹھی تھی اور اُس کے ساتھ بڑی معصومیت اور بھولے پن کا سوانگ رچا کر اپنا بھرپور پیار اُس پر نچھاور کر رہی تھی۔ دغا باز! مکّار! مارِ آستین .... وہ غصّہ کو چباتے ہوئے دل ہی دل میں بڑبڑایا ——

ہاجرہ ایک ٹھنڈی چاندنی کی رعنائیاں سمیٹے بہار کی مشکبار ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے میں داخل ہوئی اور شراب کے دو چھلکتے ہوئے جام عارف پر ڈالتے ہوئے پیار بھری نظروں سے اُسے

گھورنے لگی۔

"کیا بات ہے۔ آج نصیب دشمناں چہرے پر اداسی کے آثار کیوں؟"

"کچھ نہیں" عارف نے منہ پھیر کر لحاف کو لپیٹ لیا اور خیالوں میں کھو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اٹھے اور ایسے زہریلے خوب صورت سانپ کو مٹھی میں دبوچ کر مار ڈالے۔ مگر اس نے ضبط کیا۔ ہاجرہ اپنے شوہر کو اس طرح دیکھ کر اس کے پلنگ کے پائینتی بیٹھ گئی اور اپنے نازک ہاتھوں سے اس کے پاؤں دبانے لگی۔ نہ معلوم کب تک وہ پیر دابتی رہی کہ عارف نیند کی آغوش میں دنیا و مافیہا سے بے خبر بے پناہ کرب کو سینے سے لگا کر سو چکا تھا۔ اور ہاجرہ بھی اپنے پلنگ پر آرام کی نیند میں کھو گئی۔

آدھی رات کا سماں تھا۔ چاند کی پھیکی روشنی پر بادلوں کے سیاہ دبیز سے پردے پڑ گئے تھے۔ ایک گھٹن سی ہوا میں تھی۔ کہ اچانک عارف کی نیند ٹوٹی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی دبے پاؤں کمرے میں آکر سرہانے کھڑا ہوا ہے۔ رقیب کہیں اس کی جان لینے پر نہ تلا ہو، یہ وہم اس کے دل پر چھا گیا اور اس وسوسے نے اس کو چوکنا کر دیا۔

اس نے کمرے کی دھندلی روشنی میں دیکھا چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کمرے میں آکر کھڑکی پر پڑے پردے کو لہرا رہے تھے۔ چاند کی ترچھی کرنیں کبھی کبھی بادلوں کا دامن چیر کر ہاجرہ کے حسین رخساروں کو چھو کر غائب ہو جاتیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کائنات کا سارا تقدس، خدائی کی تمام معصومیت اسے اپنی آغوش میں سمیٹے پیار بھری لوریاں سنا رہی ہے۔ وہ انسان کے روپ میں کوئی آسمانی مخلوق نظر آرہی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر اسے گھورتا رہا۔

اس معصوم چہرے کی تہہ میں کتنے گندے، ناپاک اور متعفن کردار کے ناسور دبے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ میری ہاجرہ جو ہمیشہ مجھے اپنی بے داغ جوانی کا "پہلا پیار" "کنوارا پیار" کہہ کر دھوکا دیتی رہی۔ کس قدر چالاک عورت ہے۔ اس نے میرے اعتماد کو پاش پاش کیا ہے۔ اس

نے سگریٹ سلگایا اور اس کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔ اور دُور فضاؤں میں اپنے وجود کو تلاش کرتا رہا ـــ کہ اچانک ہاجرہ بڑبڑائی۔

"خورشید کتنے اچھے ہو تم۔ تمہارا چہرہ تو آفتاب ہے۔ میرے خورشید"

عارف کے کان یہ باور کرنے کو تیار نہ تھے۔ کہ ہاجرہ خواب میں کسی خورشید کو پکار رہی ہے اس کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں ـــ ہاجرہ نے یقین دلایا تھا کہ عارف سے پہلے اُس نے کسی کو نہ چاہا تھا۔ کسی کی خواہش نہیں کی تھی۔ اُس کے من مندر کا دیوتا تو عارف ہی تھا۔ وہ جنم جنم سے اُسی کی راہ دیکھ رہی تھی۔

لیکن یہ سیاہ گھنی زلفوں والی بھولی بھالی لڑکی جسے وہ بڑے چاؤ سے بیاہ کر لایا تھا۔ ایک زہریلی ناگن تھی ـــ اس کی قوت [illegible] ہوتی جا رہی تھی۔

وہ غور سے ہاجرہ کو گھورتا رہا۔ اُس نے کروٹ لی اور تکیہ کو اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔ تکیہ کا ریشمی [illegible] اُس کے سانسوں کی آمد و رفت میں حائل ہو رہی تھی۔ وہ بے خبر پڑی تھی۔

"اسلم ـــ اسلم تمہارے وجود میں مجھے اپنا ارمان، اپنا اچھوتا پیار [illegible] نظر آ رہا ہے۔ اسلم!"

یہ الفاظ ہاجرہ کے لبوں سے پھوٹ رہے تھے۔ اور اس آواز سے ہزار مشین گنوں کے دھماکوں سے زیادہ وحشت ناک گڑگڑاہٹ حیران و مبہوت عارف محسوس کر رہا تھا۔ وہ بے قابو ہو گیا۔

"خورشید۔ آفتاب جیسا حسن رکھنے والا، اور ارمانوں کا شہزادہ"

اسلم ـــ اور بھی نہ معلوم کتنوں کو یہ شیشے میں اُتار چکی ہو گی"

بد ذات، کمینی وہ جذبات سے مغلوب ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کی آتما چیخ کر ساری دنیا کو جگانے کے لئے مضطرب تھی۔ اُس کا دم گھُٹنے لگا۔

ایک ـــــ

دو ——

تین ——

وہ گنتا رہا۔

یوسف کا پریم پتر۔ یہ تو تلنہ کہانی ہے اور اب ایک ہی رات میں بھولی ہوئی داستانوں کو دُہرا رہی ہے یہ فاحشہ ہے آبرو باختہ ہے بدکردار ہے۔

اُس نے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ اُسے کھانسی آئی اور ہاجرہ کی آنکھ کھُل گئی۔

آپ! سوئے نہیں" وہ ایک دم اُٹھ بیٹھی۔

وہ اُٹھی اور نہایت مُخلصانہ انداز میں عارف کی دکھتی پیشانی پر ہاتھ دھر کے ہوئے بولی۔

" آپ حرارت محسوس کر رہے ہیں! یہ کیا ہوا؟" بیٹھیے میں چائے بنا لاؤں۔ پاؤں دباؤں آپ کے؟

عارف نے اس کو مکاری اور دکھاوا سمجھا اور ایک شان بے نیازی سے اُسے پلنگ پر دھکیل دیا۔

" سو جاؤ میں ٹھیک ہوں۔ تمہاری میٹھی میٹھی نیند اور سپنوں میں ارمانوں کی حسین دنیا۔ سو جاؤ نہیں مجھ سے کیا؟"

ہاجرہ ان غیر متوقع جلی کٹی باتوں سے گھبرا سی گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اُسے اندیشہ ہوا کہ کہیں عارف زیادہ بخار کے باعث حواس تو نہیں کھو رہا ——

"بیٹھئے نا آپ۔ ذرا آرام کیجئے۔ میرے ارمان تو آپ ہیں میرے خوابوں کے شہزادے آپ ہیں۔ آپ کے قدموں پر میری زندگی نثار۔ میرے سرتاج!"

بالکل ہمیشہ کی طرح ہاجرہ کے نازک نازک ہونٹوں سے یہ الفاظ نکل رہے تھے لیکن عارف ان کو ایک فلمی ڈائیلاگ کی طرح محسوس کر رہا تھا۔

"سچ ہی تو کہتی ہو تم۔ یہ خورشید کون ہے اور اسلم کون۔ جن کو گلے لگا کر تم اُن پر فدا ہو رہی تھیں؟"۔

"کون خورشید۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" وہ تھرتھراتے ہوئے بولی اور چاہا کہ ہاتھ تھام کر عارف کو پلنگ پر لٹا دے۔ لیکن عارف نے نفرت سے دھکا دیا اور غصہ میں گرج کر بولا۔

یہ ناپاک ہاتھ نہ لگاؤ مجھے۔ میں تمہیں ایک معصوم اور پاکدامن عورت سمجھتا تھا۔

"ہاجرہ۔ مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ تم ——————"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" اُس نے عارف کے مُنہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا مگر عارف نے پہلے سے زیادہ نفرت کے ساتھ اُس کے ہاتھ کو جھٹک کر ہاجرہ کو گرا دیا۔ وہ گھبرا کے اُٹھنا چاہتی تھی۔ اُس کی آواز بھرا گئی اور مثلِ بید سر سے پیر تک لرزنے لگی۔

عارف نے غصّے میں آپے سے باہر ہو کر بجلی کی ننگی تار اُس کے نیم عریاں سینے کے ساتھ لگا دی اور انتقام کے جوش میں اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ اُس کی آنکھوں سے خُون ٹپکنے لگا اور وہ دیکھتا رہا کہ ہاجرہ ایک زخمی پنچھی کی طرح پھڑپھڑائی اور دو چار لمحوں میں ہی دم توڑ بیٹھی۔ وہ ٹھنڈی ہو گئی اور عارف غصہ اور خوف سے کانپنے لگا۔ ہاجرہ کو اُس کی دغا کی سزا مل گئی ——————

اُس نے کمرے کو باہر سے مقفل کیا اور گھر سے نکل پڑا۔ وہ کہاں جائے۔ خدا کے وسیع و بسیط دُنیا اُس کے لئے تنگ نظر آرہی تھی۔ یہ کیا ہو گیا۔ اُس نے ہاجرہ سے پہلے پوچھا کیوں نہیں۔ عارف کا دماغی توازن بگڑتا جا رہا تھا۔ اُس کے ذہن کے دریچوں سے ایک معصوم اور مجبور رُوح پکار رہی تھی۔

"مُجھے مار ڈالا۔ میرے آقا! اچھا کیا۔ میرے بدن میں تمہاری ایک معصوم امانت تھی۔ تمہارے اُمر پیار کی نشانی۔ تم نے وہ بھی مٹا دی ——————"

"وہ بوکھلا اُٹھا — ہائے۔ ہاجرہ تو ماں بننے والی تھی —"

جس دن میں اُسے دُلہن بنا کر لایا تھا اور ہم نے زندگی بھر ساتھ دینے کا عہد کیا تھا۔ کتنی معصوم۔ کتنی حسین لگ رہی تھی وہ — اُس نے یقین دلایا تھا کہ اپنے حسن اور شباب کو وہ میرے لئے بچاتی رہی — اُس نے کسی مرد کی طرف آنکھ بھر کر نظر نہ ڈالی۔

خورشید کالج کا سب سے حسین اور منچلا لڑکا اُس پر جان چھڑکتا تھا مگر ہاجرہ نہ تو اُس کے مردانہ وقار اور پُرکشش شخصیت پر پسیجی اور نہ اسلم کی بے بہا دولت اُس کو راہِ مستقیم سے ڈگمگا سکی۔ ہاں ہاں اُس نے قسم کھائی تھی کہ اُس کے اچھوتے ارمانوں کی معراج میں ہی تھا۔

مگر وہ خورشید — وہ اسلم اب بھی اُس کے خوابوں کو بسائے ہیں کیا؟

اور یہ یوسف کون ہے؟ جس سے نیا نیا رومانس شروع ہوا تھا۔ میں نے پہلے پوچھا کیوں نہیں۔

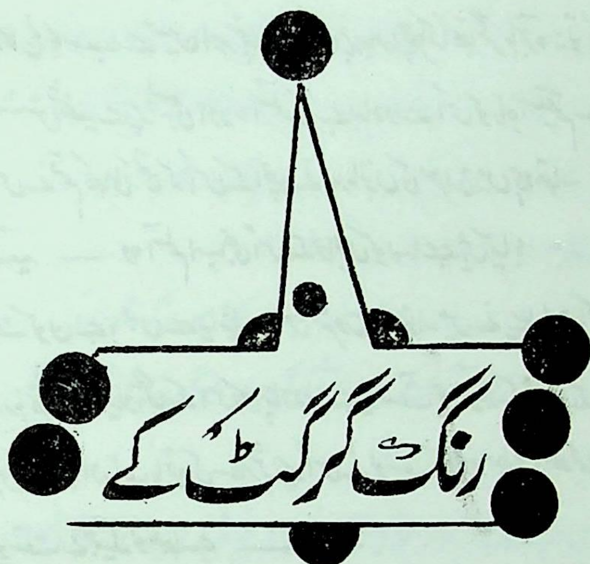
وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اُسے یاد آ گیا۔ کہ اس کا اپنا دوست یوسف جو جمیلہ کے عشق میں دیوانہ ہو کر روز اس کی منتیں کرتا تھا اور اب ہاجرہ کی سفارش پر اُس نے یوسف کو دو سطریں لکھ کر دی تھیں۔ اسی کا جواب یوسف نے جمیلہ کو لکھا ہے —

"یہ ہاجرہ کے نام تو نہیں — پھر کیا ہو گیا مجھ کو؟"

"میں نے خون کیا، بے گناہ کا خون۔ میں نے ایک معصوم حور کو قتل کیا۔"

وہ پاگلوں کی طرح چیختا ہوا واپس گھر آ گیا۔ جوش و جنون میں مقفل دروازے کو لاتوں سے توڑ کر اندر داخل ہوا۔ جہاں ہاجرہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اُس نے اُس کو بے اختیار اُٹھا کر اپنے آغوش میں لینا چاہا — وہ بھول گیا کہ بجلی کا کرنٹ اُس کے مردہ جسم کے ساتھ لگا ہوا ہے۔

عارف نے ہاجرہ کو گلے سے لگا لیا اور ندامت کے آنسوؤں کے چند موتی اُس کے گلے میں ہار بنا کر پہنانا چاہتا تھا — کہ برقی رو نے اُس کی جان بھی لے لی۔


رنگ گرگٹ کے

ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ رات کی بھیانک تاریکی میرے دل و دماغ پہ ایک وحشت سی طاری کر رہی تھی۔ ابھی شام کا حسین دُھندلکا اور شفق کی میگوں سُرخی گلاب زاروں کی سی رونق لئے تھی اور ابھی ابھی یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا ——

میرے ذہن پر نسیمہ کی حسرت و حرماں بھری تصویر چھائی تھی۔ آج اُس کا ظفر جو ہمیشہ اُس پر جان چھڑکتا تھا اس سے کنارہ کش ہو گیا تھا اور وہ ڈالی سے گرے ہوئے پھول کی طرح اپنے ارمانوں کی پامالی پر خون کے آنسو بہانے لگی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب نسیمہ اپنے دفتر میں کسی کام میں ہمہ تن مصروف تھی کہ اچانک ظفر اس کے کمرے میں داخل ہوا اور بڑی سنجیدگی سے افسر کے بارے میں نسیمہ سے استفسار کرنے لگا۔ نسیمہ نے فائل سے نگاہیں اُٹھا کر دیکھا تو اپنے سامنے حُسن و شباب کے مُجسّمے کو جو نسیمہ کی طرف ٹکٹکی باندھے نہ معلوم کب سے محوِ نظارہ تھا، کھڑا پایا۔ اُس کی لمبی لمبی پلکیں بارِ حیا سے جُھک گئیں اور اُس نے اپنا آنچل سنبھالتے ہوئے جواب دینے کی کوشش کی

"جی۔ جی۔ رام داس ملہوترہ"

نسیمہ نے محسوس کیا کہ ظفر جواب سے بے پرواہ صرف اُس کے لبوں کی حرکت اور آواز کی تھرتھراہٹ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اُس نے بھرپور نگاہ نسیمہ سراپا پر ڈالی اور وہ شرما گئی۔ لیکن ظفر اس کے

سامنے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ شاید اب وہاں سے چلے جانے کی سکت کھو بیٹھا تھا۔
نسیمہ کی نگاہوں کا جادو اُس کے دل پر وار کر گیا تھا وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ نسیمہ کے
COLLEAGUES بھی کہتے تھے کہ اُس کی آنکھوں میں بلا کی کشش ہے اور جس کی طرف بھی وہ
نظر اٹھائے وہ مسحور ہوئے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ شاید ظفر نے ایسی حسین آنکھیں اس سے پہلے نہیں
دیکھی ہوں گی۔ نسیمہ کے پھول کی پتیوں جیسے نازک اور حسین لبوں پر دل موہ لینے والی ہلکی ہلکی مسکراہٹ
جس سے ظفر نیم بسمل ہو گیا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور دل کا پیغام ایجاب و قبول بن کر ایک دوسرے
کی اضطراری کیفیت کو ظاہر کر گیا۔
دن گذرتے گئے۔ نگاہوں سے گذر کر لبوں تک دل کی باتیں پہنچنے لگیں۔ عہد و پیمان کے
محل تعمیر ہونے لگے۔ نسیمہ بھی ظفر کے خلوص اور والہانہ محبت کی اسیر ہو کر رہ گئی۔ ایک دن کی دوری
بھی اس کو شاق گزرتی اور ظفر بھی نسیمہ سے ملے بغیر چین نہ پاتا تھا۔ وہ نزدیک آتے گئے بہت نزدیک
کہ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں کی صدا سُن سکیں۔ دونوں نے زندگی بھر ساتھ دینے کے اٹوٹ
منصوبے بنائے اور نسیمہ ظفر پر مکمل اعتماد کرنے لگی۔ ایک بھرپور بھروسہ ——
لیکن موسموں کی تبدیلی کی طرح، دھوپ چھاؤں کی مانند ظفر کے دل میں کچھ تبدیلی سی آنے لگی۔ وہ اب
نسیمہ سے کچھا کچھا سا رہنے لگا۔ مچلتے ہوئے ارمان، بے قرار تمناؤں کے سمندر کی لہریں اب پُرسکون
سی ہونے لگیں۔ ملاقاتوں میں وہ جذبات کی گرمی نہ رہی۔ پھیکی پھیکی باتیں، بے کیف سی گفتگوئیں۔
اور پھر اب کبھی کبھی ظفر کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے دِنوں غائب رہتا۔ مُلاقات تپش اور ہجر کے صدمے
نسیمہ کو جلاتے رہتے۔ کبھی تو وہ دن تھے کہ نسیمہ کے انگ انگ میں شوخی بھری تھی وہ آگ کے شعلے
کی طرح دہکتی اور دمکتی ہوئی شباب کے جھولے میں جھولتی نظر آتی جہاں ہر طرف ایک سرور ہے، ایک
کیف و مستی بھرا ماحول۔ اور اب وہ چُپ چُپ سی رہتی۔ اُس کے لبوں کی لالی پھیکی پڑ گئی،

رُخساروں کی تب و تاب ماند پڑنے لگی۔ اُس کی غزالی آنکھوں سے وحشت سی برسنی معلوم ہوتی۔ اُس کے کان ظفر کی مدبھری آواز سُننے اور اُس کی نگاہیں ظفر کے وجیہہ و پُرمذاق چہرے کا طواف کرنے کو مچلتی رہتیں۔

مُلاقات کے دن وہ نگاہیں جھکا کر اپنے گلے شکوے جُدائی کے صدموں کی داستان اور آئندہ کے لئے نئے عزم و پیمان کی باتوں میں اس طرح محو ہو جاتی کہ وہ بھول جاتی کہ اس کا ظفر بے وفا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ محبت کے سفر میں اس قدر آگے بڑھ چکی تھی کہ اب پیچھے مڑ کر لوٹنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اپنا سب کچھ ظفر پر نثار کر دیا تھا اور وہ اپنے من مندر میں ظفر کو دیوتا کی طرح پوجا کرتی تھی۔

وہ محسوس کر رہی تھی کہ ظفر اب اُس کی ذات میں وہ انہماک، وہ ذوق و شوق اور وہ لگاؤ نہیں رکھتا جو پہلے پہل تھا شاید وہ بدل رہا ہے مگر اس کا معصوم دل ظفر کی بے اعتنائی کو بے وفائی پر محمول نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دل و جان سے اُس کو چاہتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ شاید اُسی کی کوئی کوتاہی ہے کوئی خامی ہے جس کی وجہ ظفر کی بے رُخی ہو سکتی ہے۔

نسیمہ کبھی یہ باور کرنے پر تیار نہ تھی کہ ظفر کے دل میں نسیمہ کے لئے ویسا ہی پیار تھا جیسا کہ وہ اُس سے پہلے غزالہ، سیما اور شیلا کے لئے رکھتا تھا۔ اور اب کسی اور حسینہ کے دام محبت میں گرفتار اُس کے ساتھ اظہارِ عشق میں اس طرح مصروف تھا کہ وہ اپنے صفحۂ دل سے نسیمہ جیسی لڑکی کا نام حرفِ غلط کی مانند مٹا چکا تھا۔ وہ جس طرح نسیمہ سے ملنے سے پہلے کئی حسین دوشیزاؤں کے ارمانوں سے کھیل چکا تھا۔ اور اب اُن کو یاد کرنے کی بھی مہلت نہ پاتا تھا۔ نسیمہ کی قسمت میں بھی وہی تھا۔ ظفر اُس کو بھول گیا۔ جیسے کہ کبھی ملاقات ہی نہ ہوئی ہو مگر ——— نسیمہ قیامت کے دن تک اُس کی راہ میں آنکھیں بچھائے انتظار کی تلخیوں کو جھیلنے کی قسم کھائے بیٹھی تھی۔ ہجر و فراق کی آگ نے نسیمہ کا پھول سا بدن جُھلسا دیا۔ وہ تڑپتی رہی آہیں بھرتی رہی۔ اُس کی راتوں کی نیندیں اُجڑ گئیں۔ دنیا کی رعنائیاں اُس کے لئے بے معنی تھیں۔

ظفر جو اس کے گلستانِ حیات میں بہار کی پُر فضا رونق بن کر داخل ہوا تھا، بادِ سموم کے جھونکھوں کی طرح وہاں سے اس طرح چل دیا کہ اب ہر پھول مُرجھا گیا، ہر کلی سوکھ گئی۔

نسیمہ نے ظفر کو خط لکھے۔ مگر اس کے دلِ بیتاب کی داستانِ غم ظفر پر کوئی اثر نہ کر سکی۔ اس کے نامہ ہائے محبت صدا بہ صحرا ثابت ہوئے۔ نہ معلوم ظفر اُن کو پڑھنا بھی گوارا کرتا تھا یا نہیں۔ مگر نسیمہ کو اس طرف سے کبھی دلاسا اور تسلی کا ایک لفظ بھی نہ ملا جو اُس کے زخمہائے دل کے لئے مرہم ثابت ہوتا۔

ظفر بھونرے کی طرح کسی چمن میں کھلے شاداب پھولوں پر منڈلاتا اور پھر بڑی بے اعتنائی سے مسلے ہوئے پھولوں کو ناقابلِ اعتنا سمجھ کر نو بہار میں کِھلنے والی دوسری کلیوں کی ٹوہ میں لگ جاتا۔ اس کی جاذبِ نظر شخصیت اور اس کے جمال و جمال اور مردانہ وقار کے ساتھ ساتھ بھولی بھالی معصوم دوشیزاؤں کو شیشے میں اُتارنے کا اُس کا مکر و فریب بھرا فن نہ معلوم کتنی معصوم جوانیوں کو برباد کر چکا تھا۔ مگر نسیمہ اس کے کردار کے اس متعفن اور مکروہ پہلو کو محض الزام یا رقابت سمجھ کر بالکل بے بنیاد جانتی۔ اس کی نظروں میں ظفر ایک فرشتہ تھا صادق القول، خلوص و وفا کا پیکر۔ وہ کیسے باور کرے کہ اُس پر اپنی جان نثار کرنے والا۔ اس کے شمعِ حُسن پر پروانہ وار نثار ہونے والا ظفر بے وفا بھی ہو سکتا ہے۔

نسیمہ کو یہ غم دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ اس کا زہد شکن اور ملک فریب حُسن، اس کے شباب کا بدرِ کامل اب دل کے تہہ خانوں میں دبے اور چھپے ہوئے انگاروں کی آنچ میں آہستہ آہستہ جلنے لگا۔

نسیمہ ہزاروں میں ایک تھی اور لڑکپن سے جوانی تک کتنے ہی دل پھینک نوجوان اُسے دیکھ کر نذرانۂ دل پیش کرنے پر مجبور ہوا کرتے تھے مگر وہ کسی کی طرف آنکھ اُٹھانا بھی اپنے حُسن کی توہین سمجھتی تھی۔ مگر پہلی ہی نظر میں ظفر اس کے دل میں سما گیا تھا۔ وہ اس کی ہو گئی تھی۔ وہ کسی سے اپنے دل کا راز کہہ بھی نہ سکتی تھی۔ لیکن اُس کی ویران آنکھوں کی وحشت، اور اُس کا اُداس اُداس

چہرہ ہر دیکھنے والے کو دل میں چھپے کرب کی داستان سُنا دیتا۔ اس کے ناز بردار والدین بھی اُس کی غم آلودہ زندگی سے محزون و مغموم رہنے لگے مگر کیا کرتے۔

نسیمہ جوان تھی برسرِ روزگار تھی اور ابھی اُس کے حسن و شباب کا تاج محل کھنڈر نہیں بن چکا تھا۔ اس میں فطری جاذبیت اور کشش کے آثار باقی تھے۔ کئی جگہ سے اُس کے لئے رشتوں کے پیغام آئے مگر وہ ظفر کے خیالوں میں اس قدر ڈوبی تھی کہ کسی بھی جگہ ہاں کرنے پر تیار نہ ہوتی تھی۔

اُس کے اِس رویے سے اس کی سہلیاں بھی تنگ آگئیں۔ وہ کبھی کچھ اور کبھی کچھ کہہ کر اس کا دِل بہلایا کرتیں تھیں۔ مگر ایک نسیمہ تھی جو اتنی سنجیدہ بن گئی تھی کہ دس باتوں کا ایک جواب دیا کرتی تھی۔ اگر کوئی لڑکی اُس کو ہنسانے کی کوشش کرتی تو بے اختیار نسیمہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے۔ اور اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر موتی سے لڑھک جاتے۔

ایک دن ظفر کے آنے کی خبر کسی سہیلی نے سُنائی تو نسیمہ نے محسوس کیا کہ اُس کے انتظار کی گھڑیاں بیت گئیں، ہجر کی تاریک راتیں کٹ گئیں اور مُسکراتی ہوئی صُبحِ وصال اپنی پوری برنائی اور رعنائی کے ساتھ اُس کے اُفقِ تقدیر پر جگمگانے والی ہے۔ وہ اب اپنے ظفر کو پائے گی اور ہمیشہ کے لئے اُسی کی ہو جائے گی۔

بڑی بیقراری سے تڑپ تڑپ کر وہ رات گذاری اور صُبح ہوتے ہی اپنی سہیلی کے گھر وہ چل دی۔ دل میں ارمانوں کا ایک مچلتا طوفان تھا، جس کو سنبھالے وہ نہ معلوم کتنی اُمیدوں اور آرزوؤں کا چراغاں کئے جا رہی تھی۔

ظفر سہیلی کا مہمان تھا۔ جونہی نسیمہ نے دیکھا تو اس کو یقین نہ آیا کہ سچ مچ آج اُس نے یوسفِ گم گشتہ کو پالیا اور اس کی بے نُور آنکھوں میں مُحبّت کی چمک آگئی۔ اس نے فرطِ جذبات میں آنسوؤں کے موتی نذر کئے۔ لب پھڑپھڑائے مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی صرف دیکھتی رہی۔ اس کا دل

بے اختیار ظفر کے قریب جا کر اس کے قدموں سے لپٹ کر آنسوؤں سے اُن قدموں کو دھونے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا تاکہ ظفر کے پتھر جیسے دل پر اس کی بیکسی اور مجبوری کا اثر ہو۔ وہ اُس کی وفا کی قدر کرے۔ لیکن ظفر نے جیسے اُسے پہچانا تک نہیں۔ رسمی خیر و عافیت پوچھی گویا حافظے پر زور دے کر یاد کر رہا ہو کہ یہ کون لڑکی ہے اور کس طرح اس سے شناسائی ہوئی تھی۔

نسیمہ یہ برداشت نہ کر سکی اس کا دل سینے میں دھک دھک دھڑکنے لگا۔ سر چکرا گیا۔ اور آنکھوں میں مُردنی سی چھا گئی۔ قریب تھا کہ وہ غش کھا کر گر پڑے کہ سہیلی نے اُسے سنبھال لیا اور ساتھ والے کمرے میں لے گئی۔ کچھ دیر بعد جب اس کے حواس بجا ہوئے تو آنسوؤں کی بارش اور ہچکیوں کے تانتے میں نسیمہ نے اس سے سارا حال بیان کر دیا اور نرم دل سہیلی کا دل بھر آیا۔ ظفر اس کا دُور کا رشتہ دار تھا۔ اس کے کرتوت جان کر اُس سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ اُٹھی اور ظفر کو کرخت آواز میں مخاطب کر کے ایک معصوم لڑکی کی زندگی کا واسطہ دے کر شرافت، انسانیت اور اخلاق کے نام پر اس کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی پوری کوشش کی مگر ظفر بُت بنا سب کچھ سُنتا رہا اور کہا کہ

"میں اس لڑکی کو نہیں جانتا۔ میں نے اپنی زندگی بنا لی ہے۔"

نسیمہ یہ سُن رہی تھی دیکھ رہی تھی۔ اس کی گھائل آتما چیخ چیخ کر چلا کر احتجاج کرنا چاہتی تھی مگر اس کے لبوں پر مُہر لگ گئی۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی رہ گئیں ———

"کیا ظفر سچ مچ گرگٹ کی طرح رنگ بدل سکتا ہے؟ کیا نسوانی وفا کا بدلہ اس طرح بھی مل سکتا ہے!

کیا.......؟ اور سوچنے سے نسیمہ بالکل قاصر رہی......!



ناصر کی اچانک موت سے اُن کے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ تمام احباب، واعزا، ہمسایہ ا
زدعار اس کی جوانمرگی پر خون کے آنسو بہا رہے تھے۔ مگر اس کی رفیقۂ حیات کی پلکیں تک نہ بھیگیں۔ اپنی سا
اور نندوں، دوسری رشتہ دار اور پڑوسی عورتوں کے نالۂ وشیون کے ہنگاموں میں بھی شامل نہ تھی بلکہ ا
نوحہ وماتم کی محفل میں شریک ہونے والوں کی خاطر تواضع اور میزبانی میں مصروف اِدھر اُدھر گھوم رہی
گویا اٹھائیس سالہ نوجوان شوہر کی موت اس کے لیے کوئی ایسا المناک حادثہ نہ تھا کہ وہ چوڑیاں بڑھا
بال کھول دیتی اور اپنی مانگ اُجڑ جانے پر دکھاوے ہی کو سہی، آہ و بکا کرتی یا کم از کم سوگوار صورت بنا کر
جاتی ——

ناصرہ کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے۔ مگر ابھی تک اس کا آنگن کسی ننھے مُنے نونہال کی
سے خالی اور اس کا آغوش سونا تھا۔ وہ زیادہ تر میکے ہی میں رہتی تھی اور اپنے سرتاج کی زندگی میں ہی ا
آپ کو "رانڈ" کہا کرتی تھی۔ لوگ اس کے اس انوکھے انداز اور کوسنے پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں
لیکن اصلی حقیقت سے کوئی واقف نہ تھا ——

لاڈلے بیٹے کی دُلہن، نازوں والے بھائی کی رفیقۂ حیات پر ساس اور نندیں جان چھڑ
ناصر ایک خوبرو، خوش اخلاق اور صحت مند جوان تھا۔ جو اپنی بیوی کی نازبرداری میں کو

اٹھا نہ رکھتا تھا۔ لیکن وہ اُسے کھینچی کھینچی سی رہتی۔ جب بھی اس سے ملتی تو ہنسی ہنسی میں اپنی بات آئے تو خود کو "بیوہ" کا نام دے کر ہی رہتی۔ اور ناصر اسے مذاق سمجھتا یا شوخی۔ لیکن کبھی کبھار وہ محسوس کرتا کہ "ہر شادی شدہ عورت" کی تمنا ہوتی ہے کہ وہ ماں بنے، اس کے نخل حیات میں کوئی کونپل پھوٹے، کوئی کلی کِھلے اور گلشن تمنا میں پھول مہکیں شاید ناصرہ تہی آغوش ہونے کے باعث اس قدر افسردہ دل ہے۔

مُجھے معلوم ہے کہ لڑکپن میں ناصرہ اسلم کو چاہتی تھی اور دونوں ایک دوسرے سے بے انتہا پیار کرتے تھے مگر اب وہ ناصر کی شریکِ زندگی تھی اور چاروناچار پُرانے خوابوں کو دفنا کر اس کو اپنی زندگی نئے ماحول اور نئی منزل کے حوالے کرنا تھی۔ بظاہر یہاں کسی قسم کی ناچاقی یا اختلاف کا کوئی جواز نہ تھا۔ شوہر خدا کے فضل سے ایسا ملا تھا جو ہزاروں میں ایک، ساس نُندیں فرشتہ سیرت اور ناز بردار ــــ

وہ ہمیشہ سفید اور سادہ لباس پہنا کرتی تھی۔ نہ زیب و زینت سے دلچسپی، نہ بناؤ سنگار سے لگاؤ تھا۔ اور جب کوئی ٹوکتا تو کہتی کہ بیوگی کے ایام اسی طرح کٹتے ہیں "رانڈ جو ٹھہری" ــــ ایک دن وہ اپنے رفیقِ حیات کے ساتھ تنہا بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور ناصر چاہتا تھا کہ اس کے چہرے پر بھی وہ رونق اور رعنائی دیکھے جو نوجوان لڑکیوں کے چہروں پر شادی کے بعد پائی جاتی ہے۔ وہ بہت پیار سے اس کو دیکھ رہا تھا کہ ناصرہ کی زبان سے نکلا "کاش میں اسلم کی بیوی ہوتی ــــــــ"

ناصر نے اُس کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب لاتے ہوئے اس سے کہا "میرا نام اسلم نہ سہی۔ تمہارا ہم نام تو ہوں۔ قدرت نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے لئے پیدا کیا ہے۔ تم کتنی پیاری ہو۔ کتنی اچھی ہو ناصرہ ــــــــ

لیکن ناصرہ ان باتوں سے بالکل متاثر نہ ہوئی اور بے توجہی سے اُٹھ کر چل دی۔

ناصر کو اپنی بیوی کی عفت اور وفاداری پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ اس کو دل سے چاہتا تھا۔ اس کے دل میں اسلم کا نام سُن کر بھی کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسلم کون ہے.....!

ایک دفعہ ناصرہ نے شوخی سے کہا کہ "شادی کے بعد میرا نام ناصرہ ناصر ہو گیا۔ لوگ اس پر ہنستے ہوں گے۔ اگر ہمارے الگ الگ نام ہوتے ——— یہ بھی کوئی نام ہوا ناصرہ ناصر ———! وہ منھ بنا کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے لگی"۔

اچھا تو تم بیگم ناصر لکھا کرو۔ ناصر نے اُس کے رُخساروں پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ناصرہ نے ایک سرد آہ بھر کر آنکھیں جھکالیں "ہاں ٹھیک ہے لیکن ———"

اور پھر ناصر کی محبّت بھری جوان باہوں میں جھول کر وہ دل ہی دل میں دبے ہوئے کرب کو ہونٹوں تک نہ لاتی۔ مگر اس نے اپنے آپ کو کبھی "بیگم ناصر" لکھنا قبول نہ کیا اور ناصرہ ناصر کے نام سے تو اس سے چڑ تھی ہی ———

ایک بار کسی سہیلی کو خط لکھا تو اپنا نام لکھتے ہوئے غیر شعوری طور پر شاید وہ "بیوہ ناصر" لکھ کر خود ہی گھبرا سی گئی۔ لیکن اپنی سہیلیوں اور ہمجولیوں میں وہ اپنے آپ کو "بیوہ" کہتے ہوئے کبھی شرم محسوس نہ کرتی تھی۔

بارش تھم چکی تھی اور میں تنہائی سے اکتا کر کچھ دیر کے لئے ناصرہ کے گھر گئی۔ وہ سچ مچ بیوہ نظر آرہی تھی۔ نہ آنکھوں میں سُرمہ، نہ بالوں میں کنگھی، نہ شوخ رنگین لباس ———

میں نے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ناصرہ! ——— تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیوں اپنی جوانی کو اجیرن کر رہی ہو۔ کیا تم اپنی شوہر ناصر صاحب سے خوش نہیں ہو؟"

"شوہر!" اُس نے عجیب لہجے میں جواب دیا ———

"میں تو بیوہ ہوں ——— میرا شوہر کہاں ہے۔ آہ۔ کاش میں سچ مچ بیوہ ہوتی۔!" میں نے اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"پگلی ایسی باتیں مُنھ سے نہیں نکالتے۔ خدا تمہارا سہاگ سدا قائم رکھے"۔

ہاں میرا سہاگ۔ خدا میرا سہاگ (پھر آنکھوں کو ایک پُر کیف جنبش سے ہلاتے ہوئے دھیمی آواز

میں) اسلم کو خدا قائم رکھے ۔"

وہ بڑبڑاتی رہی۔ میں نے سمجھایا کہ اس کے یہ لچھن اچھے نہیں ہیں۔ وہ کسی کے گھر دُلہن بن کے آئی ہے۔ سماج اور مذہب کے اصول اس کو کسی کے حوالے کر چکے ہیں۔ اخلاق اور شرافت کا تقاضا اُسے نبھانا چاہیئے۔

"تم نے شادی کے دن ہاں ہی کیوں کی تھی؟ — میں نے پوچھا

اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا" مجھ سے پوچھا کس نے ——"

"کس لڑکی سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ جس کے پلّے سے تم باندھی جا رہی ہو۔ تمہیں وہ مرد قبول بھی ہے کہ نہیں؟

"شیلا! ہم تو بے زبان جانور ہیں۔ ماں باپ جس کو چاہیں۔ اُس کے گھر ہماری زندگی کا سودا ہو جاتا ہے۔ کیا مجال کہ کوئی لڑکی، شریف لڑکی دم بھی مار سکے ——"

مجھے اُس کے حال پر ترس سا آنے لگا اور نفرت کا جذبہ ہمدردی میں بدل گیا۔ میں نے کہا۔

تو کیا تم ناصر کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتی ہو ——"

ناصرہ نے ایک آہ بھر کر جس میں اس کے دل کی گہرائیوں میں چھپے بے پناہ کرب کی تپش اور تڑپ تھی، حسرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور دبی زبان میں کہنے لگی۔

"میں صبر کے ساتھ موت کا انتظار کروں گا۔ میں ناصر سے طلاق نہیں لے سکتی۔ یہ قدرت کے ہاتھ ہے کہ میں رنڈاپے کا جیون کب تک برداشت کر سکوں گی۔ میں مر گئی تو میرے ساتھ میرے ارمان۔ میری حسرتیں، میری تمنائیں سب ختم ہوں گی...... نہیں نہیں — پھر اسلم کا کیا ہوگا" اس کی پلکوں پر دو موتی جیسے لرزنے لگے۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جانتی ہو۔ اسلم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ عمر بھر میرا انتظار کرے گا۔ چاہے میرے بال بھی سفید ہو جائیں —— آہ —— وہ آج بھی میرا منتظر ہے۔ کسی دن قفس ٹوٹے گا اور قیدی پرندہ اپنے آشیانے کی طرف پرواز کرے گا ——"

میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا ـــــ "فرض کرو۔ اگر اسلم کی بھی کسی اور کے ساتھ شادی ہو جائے۔ تو ـــــ"

پگلی ! ـــــ اسلم اگر شادی کرے گا تو صرف مجھ سے ورنہ وہ عمر بھر کنوارا رہے گا ـــــ"

ناصرہ نے بڑے وثوق اور اعتماد سے مجھے سُنایا۔ مجھے اس کی سادگی پر ترس آنے لگا۔ مگر اس کے جذبات کو ٹھیس پہچانا نہیں چاہتی تھی۔

بات کا رُخ بدلتے ہوئے میں نے پوچھا " اچھا اب میکے میں کتنے دن پڑی رہو گی ۔ ؟"

وہ جلدی بول اُٹھی۔ "ابھی تو مہینہ بھی نہیں ہوا ہے یہاں ـــــ وہ کئی چکر لگا گئے۔ امّاں جان بھی منّتیں کر رہی تھیں"۔ جانا ہی پڑے گا۔ کیا کروں ؟ ـــــ"

ناصرہ سُسرال گئی ـــــ تو دوسری ہی صُبح ناصر کی اچانک موت کی رُوح فرسا خبر سے سارا محلہ ماتم کدہ بن گیا۔ میں نے سُنا تو دنیا میری نگاہوں میں گھوم گئی۔ گویا ایک بھونچال آ رہا ہو۔ سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں نا ـــــ کہ بار بار کوئی بات دہرانے سے وہ بات ہو ہی جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو بیوہ کہتی تھی ـــــ

آہ ! ـــــ

آج وہ سچ مُچ ہوگئی ـــــ میرا دل اس تصوّر سے ڈوبنے لگتا۔ آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ میری نظروں میں ناصر کا وجیہ چہرہ اس کی بھرپور جوانی کا نقشہ بسا ہوا تھا اور دل یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ ناصر کی لاش سُپردِ خاک کی گئی۔ وہ چاند زمین میں چھپ جائے۔ دنیا اندھیری دکھائی دینے لگی ـــــ

دو تین دن بعد جب میں پُرسا دینے گئی تو دیکھا ناصرہ ہشاش بشاش بُلبل کی طرح چہک رہی ہے۔ میں نے غم کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تم جو بیوہ ـــــ" بات کاٹتے ہوئے وہ بیچ میں بول اُٹھی۔ "ہاہا ! مجھے بیوہ نہ کہو ـــــ میں سہاگن ہوں۔ میرا اسلم ـــــ خُدا اُسے سلامت رکھے۔

ابھی ناصر کی قبر کے پھول مرجھائے نہ تھے کہ ناصرہ نے اسلم سے ملاقات کی کوشش کی۔ اُسے ڈھونڈا۔ بُلوایا مگر جب کہیں نہ مل سکا تو بیتاب ہو کر خود اس کے گھر جا پہنچی۔

"کس طرح ہجر کے طویل سال ہم دونوں نے بیقراری سے بتائے اور اس گھڑی کے منتظر تھے کہ کب میری آزادی کا دن آجائے اور ہم دو رندوں۔ ہمیشہ کے لئے —" وہ خوشی میں جھومتی جا رہی تھی —" مگر ناصر کی موت کی خبر اس نے سُنی ہوگی۔ وہ لپک کر میرے پاس مجھے پانے کی خوشی میں کیوں نہ آیا۔ شاید اُسے پتہ نہ چلا ہو —" ان ہی خیالات میں وہ بناؤ سنگار کئے ہرنی کی طرح مست چال میں قدم بڑھاتے جب دہلیز کے اندر داخل ہوئی تو اسلم کی منتظر نگاہوں کے بدلے اس کو وہاں ایسی برق نظر آئی جس سے اُس کا خرمنِ حیات جل کر خاکستر ہو گیا۔ وہ کبھی خواب میں بھی یہ تصور نہ کر سکتی تھی کہ اسلم کے شبستانِ حیات میں ایک شوخ اور چنچل جمیلہ کا جمال جگمگا رہا ہو۔

جمیلہ!

جو ناصرہ سے زیادہ حسین، زیادہ سلیقہ مند، زیادہ تعلیم یافتہ اور مقابلتاً امیر خاندان کی چشم و چراغ تھی۔

اسلم کے ذہن و دل سے ماضی کے نقوش مٹ چکے تھے اُسے یاد بھی نہ تھا کہ کبھی ناصرہ کے ساتھ چشمہ شاہی، گلمرگ و پہلگام، ہارون کی فضاؤں میں اُس نے زندگی بھر ساتھ دینے کے عہد و پیمان کئے تھے۔

آج بیوہ ناصرہ اپنے دل میں کتنی اُمیدیں اور ارمان لئے جب وہاں پہنچی تو ایک بیوہ کا اپنی سہاگن بیوی کے کمرے میں داخل ہونا بھی اسلم کو بدشگون نظر آیا۔ رسمی طور پر ناصر

کی جوانمرگی پر اظہارِ افسوس کے بعد ناصرہ کو اُس نے رُخصت کر دیا۔

ناصرہ نے اپنے خوابوں میں جو تاج محل تعمیر کیے۔ دھڑام سے وہ گِر کر چُور ہو گئے۔ اُسکی آنکھوں میں سارا عالم سیاہ ہو گیا۔ زمین سخت اور آسمان دُور نظر آنے لگا۔ خوشی خوشی عدّہ کے ایام گزار کر اُس پر جو بجلی گری اُس نے اُس کا رنگِ حیات بالکل ہی بدل دیا۔ وہ ناصر کی موت کے بعد کہتی کہ مجھے بیوہ نہ کہو۔ میں سہاگن ہوں۔ میرا اسلم —— مگر

آج وہ چمن کی ایک اُجڑی ہوئی شاخ کی طرح نڈھال اور بے برگ وبار ہر وقت آنسو بہاتی نظر آتی تھی —

"کاش اپنے حقیقی سرتاج سے جا ملتی۔ کاش اسی کے پہلو میں مجھے تھوڑی سی زمین مل سکتی"

کون سا حقیقی سرتاج ہے تمہارا —— "میں نے اس کی دُکھتی رگ کو چھیڑتے ہوئے کہا اُس کی آنکھوں میں چشمہ اُبل پڑا۔

وہ فرطِ غم سے میرے سینے سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔" بہن شیلا میں بیوہ ہو گئی ہوں۔ میری مانگ اُجڑ گئی۔ میں رانڈ ہوں شیلا ——"

میں نے اس کی حالت پر بہت افسوس کیا مگر اب سوائے آنسوؤں کی سوغات کے میں بھی اُسے اور کیا دے سکتی تھی۔

۵۱

نئی منزل نیا سفر

پیاری نجمہ!

ایسا لگتا ہے صدیاں بیت گئیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ تمہیں بھول گئی۔ جب بھی کسی سہیلی کو اپنی ہم سن شوخ و شنگ ہمجولی کے ساتھ بولئے، اپنے اپنے دل کی داستان دہراتے، آپس میں مذاق کرتے مُسکراتے، کبھی ہاتھوں میں ہاتھ لئے ناز و ادا سے چلتے اور کبھی ایک دوسرے سے گلے شکوے کرتے دیکھ لیتی ہوں تو یادوں کے جھروکے میں مجھے تم مُسکراتی نظر آتی ہو اور لڑکپن کی وہ شرارتیں اور باہمی خلوص و محبّت کے وہ رنگین سائے نگاہوں میں گھوم جاتے ہیں۔

میں نے تم کو خط نہ لکھا۔ معاف کرنا نجمہ!

گھریلو ذمہ داریوں میں وقت اتنی تیزی سے گزرتا گیا کہ بارہا سوچا، ارادہ کیا، قلم اُٹھایا کبھی کچھ لکھا بھی مگر ـــــ پھر بھی تم کو خط نہ لکھ سکی۔

تنہائیوں میں تم یاد آتی رہی ہو۔ آج وہ دورے پر گئے ہیں۔ بے بی سو رہی ہے اور شریر مُنا ابھی بالواڑی سے نہیں لوٹا۔ میں تم کو خط لکھنے بیٹھی۔ نہ معلوم تم مجھے بھول گئی ہو یا ناراض ہو؟ میں نہ لکھ سکی۔ تو کم از کم تم ہی نے کبھی یاد کیا ہوتا۔ خیر میں ہی خطاوار ہوں۔ کیا تمہارے دستِ نازک لکھے دو چار حسین جملوں کی راہ دیکھوں؟ ــــ بولو کیسی ہو میری نجو!

تمہاری سلمہ

نجمہ پیاری!

تم کو تعجب ہوا کہ میں دو بچوں کی ماں ہوں۔ تم ابھی تک کنواری ہو یہ بھی عجیب ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم نے بھی اپنا گھر بسایا ہوگا۔ تمہاری آغوش میں بھی کوئی ننھی سی جان پل رہی ہوگی۔ تمہارے گلشنِ حیات میں بھی کلیاں پھوٹیں اور پھول کھلے ہوں گے۔

یہ کیا فلسفۂ حیات ہے تمہارا؟ —— جوانی کے خوابوں کی تعبیر شاید ہی کسی کے حق میں صحیح نکلتی ہو۔ تم اب بھی خوابوں کی دنیا میں ہو —— کب تک اس طرح اپنے والدین اور خود پر بوجھ بنی رہوگی۔

نجو! میں نے بھی شکیل کو چاہا تھا۔ اُس بے وفا کو مگر —— ...

میری کشتیٔ حیات کو کنارہ مل گیا اور میں اُسے بھول گئی۔ میں اپنی موجودہ زندگی سے پوری طرح مطمئن ہوں، خوش ہوں۔ تمہارے جیجاجی میرا بہت خیال رکھتے ہیں اور ہماری زندگی قابلِ رشک ہے

تُمہارے لئے پُرخلوص دُعاؤں کے ساتھ

تمہاری اپنی

سلمیٰ

پگلی نجو!

اگر نزدیک ہوتیں تو میں تمہاری اس معصومیت، اس بھولے پن، اس سادگی پر تم کو سزا دیتی۔ تمہارے پھول جیسے رُخساروں پر ایک چپت رسید کرتی۔ تم کسی کے لئے اپنا شباب، اپنے ارمان اور اپنی زندگی کو اُجاڑ رہی ہو۔ کیا پتہ وہ تمہیں بھول چکا ہو۔

اپنی زندگی کی کوئی منزل چن لو نا؟ ۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ حالات سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑتا ہے۔

تُم نے لکھا تھا کہ کسی جگہ بات چیت طے ہو رہی ہے؟ —— مان لو اب تم... ... مجھے

اُمید ہے کہ اگلے خط میں تم اپنی شادی کی خوشخبری سُناؤ گی۔

بے بی اور مُنا اپنی خالہ کو تسلیم کہہ رہے ہیں

تمہاری اپنی بہن

سلمیٰ

نجمہ!

تمہاری بے کیف زندگی۔ تمہاری ڈولتی نیا، طوفانوں کے حوالے! ــــــ تمہارے خط مجھے تڑپاتے ہیں۔

فوٹو بھیج رہی ہوں۔ میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھو۔ تمہیں دُلہن کے روپ میں مُسکراتی ہوئی دیکھنے کا انتظار کر رہی ہیں یہ ــــــ اور میری طرح ننھے "منے" بھی ــــــ

فرصت میں تم کو پھر لکھوں گی۔ تم بُرا نہیں مانو گی۔ سچ مانو نجو! مجھے بھی جب وہ بیتے دن یاد آتے ہیں تو دل میں کچو کے سے لگتے ہیں۔ ہمارے وہ عہد و پیماں اور زندگی بھر ساتھ دینے کی قسمیں۔ مگر میں خیالوں کی دُنیا سے دُور حقیقتوں کی ٹھوس مسرتوں سے لُطف اندوز ہونے کا گُر جانتی ہوں۔

بُری لگتی ہوں گی میری باتیں ــــــ ؟ اچھا میری راہبہ اب نہ کہوں گی۔

تمہاری

سلمیٰ

میری پیاری پیاری نجو!

مُبارک صد مُبارک۔ کُفر ٹوٹا خُدا خُدا کر کے۔ تم نے مان لیا۔ اچھا کیا۔ تمہارے جیجا جی ضرور تمہارے منگیتر کو دیکھ لیں گے۔ ہاں ٹھیک ہی تو ہے اُن پر تم کو اعتماد ہے اور یقین کرو کہ تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچے گی۔

میرے ہونے والے جیجاجی! خُدا کرے تمہارے خوابوں تمہارے ارمانوں کی معراج ثابت ہوں۔
ابّا جان نے جو فیصلہ کیا ہے مجھے پورا بھروسہ ہے کہ وہ ضرور تمہارے مستقبل کو تابناک بنائے گا۔

تم وہم وگمان کو چھوڑ کر بس اب نئی زندگی کے نئے سفر پر دل سے راضی ہو جاؤ۔
ہاں تم نے نام نہیں لکھا میرے ہونے والے جیجاجی کا۔

نیک دُعاؤں کے ساتھ

تمہاری پُر بہار زندگی کی مُتمنی

تمہاری سلمہ

نجمہ!

میں نے تم سے جان بوجھ کر کوئی راز نہیں چھپایا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے سرتاج، میری زندگی کے مالک، میرے رفیقِ حیات عارف، وہی ہیں جن کی یاد تم کو تڑپاتی رہی ہے اور جن کی جُدائی میں تم نے اپنی جوانی کی بہاروں کو خزاں میں بدل دیا۔ جس کے فراق میں تمہارے رُخساروں کے گُلاب گیندے کی طرح زرد ہو گئے۔ ٹھیک ہے مجھے تمہاری ساری داستانِ محبت یاد ہے مگر تم نے مُجھے کب اُن کو دکھایا یا بتایا تھا؟ —— میری نجمہ میں تمہارے حق پر کبھی ڈاکہ نہ ڈالتی اگر ایسا ہو سکتا کہ مجھے یہ راز معلوم ہو جاتا تو میں نہ معلوم کیا کر بیٹھتی ——

اللہ تمہیں نئی زندگی مبارک کرے۔ تم بھول جاؤ اپنے ماضی کو —— وہ خود تمہاری شادی کی بات طے کرتے جائیں گے۔ ان کو یاد بھی نہیں کہ کبھی تم کو چاہتے تھے تم سے پیار کرتے تھے۔ تم بھی بھول جاؤ پُرانی باتوں کو —— تم کو میری قسم نجمہ! عارف کو مُجھے بخش دو۔

تمہاری اپنی بہن

سلمہ

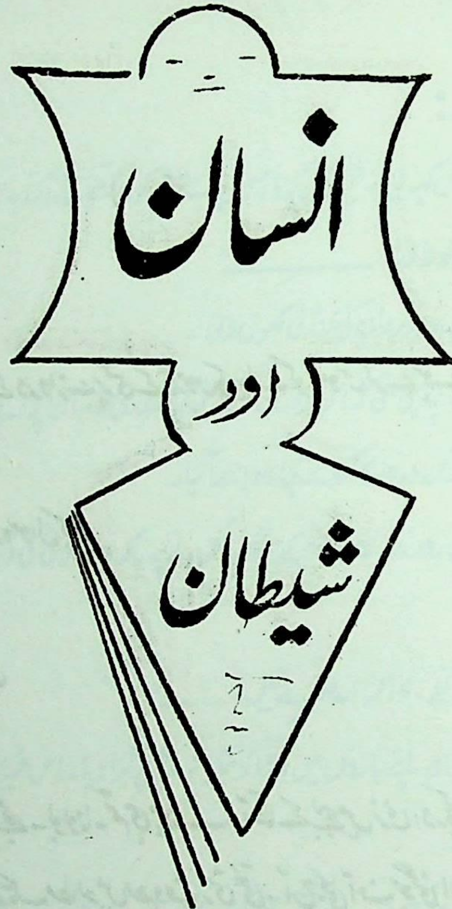
نجمہ!

ہاں ہاں وہی شکیل، میرے خوابوں کا شہزادہ ـــــــ میرا محبوب! وعدہ شکن، بے وفا ـــ

مان لو میری نجو! ـــــــ میری بھیگی پلکیں، میرا دھڑکتا دل تمہاری زندگی کو آباد دیکھنے کی دُعا

کر رہا ہے۔

اپنی سلمہ کی طرف سے مبارک باد قبول کرو۔


انسان
اور
شیطان

"کون" آشا اپنے کمرے کے دروازے پر کسی کے قدموں کی چاپ کو محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا؟

'میں ہوں' ۔ ایک آواز!

'کون' ۔ آشا نے دوبارہ سوال کیا۔

'کہا نا ۔ میں ہوں!

"وجے!" آشا نے پوچھا

"کون وجے؟"

"وجے! کیوں بنا رہے ہو مجھے ۔ بولو نا ۔ تم ہی ہو نا ۔۔۔" آشا کے لہجے میں نرمی اور کچھ تجسس کا رنگ تھا۔

آشا اپنے کمرے میں اکثر دیر تک مطالعہ میں مصروف رہتی تھی ۔ آج بجلی آف ہو گئی اور اُسے مجبوراً وقت سے پہلے ہی بستر میں دبکنا پڑا تھا ۔ خزاں کی ہلکی ہلکی خنک ہوا دریچوں سے اندر آرہی تھی ۔ اور جلدی ہی نیند کی دیوی نے آشا کو خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیا۔

اچانک کسی کی آہٹ سے وہ جاگ پڑی ۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا ۔ وہ حیران سی ہوئی کہ اس وقت "وجے" اُس کے پاس کیوں آیا ۔۔۔۔

"ہاں آشا ۔ میں ہی بول رہا ہوں ۔ دروازہ کھولو نا" ۔ اُس نے جواب دیا۔

سوئے نہیں؟ بجلی چلی گئی ——"

شا بستر چھوڑ کر اُٹھنے لگی۔ "کیا کام ہے مجھ سے اس وقت؟" وہ سمجھی شاید موم بتی یا ... مانگنے

یا ہوگا وجے۔

ے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

کیا کہنا ہے تمہیں۔ کل کہہ لینا۔ میں سمجھی کہ ماچس چاہیئے تم کو۔ آشا نے اکتاہٹ سے جواب دیا۔

آشا! دروازہ کھولو نا ذرا ——"

غیر شعوری طور پر اُٹھی اور دروازہ کی کنڈی کھول دی۔

کھڑے کھڑے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس وقت وجے کو کیا ضروری کام آن پڑا ہے

ولتا کیوں نہیں ——" لیکن دروازہ کھولتے ہی وہ اندر آگیا۔

گھبرا سی گئی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے چاہا کہ دیا سلائی کی ڈبیہ تلاش کرے وہ کہ

پڑی تھی۔

تم نہیں پوچھ سکتے تھے۔ جو اس اندھیرے میں ——"

فکر آشا ——" وہ اُٹھا اور اپنے بازوؤں میں آشا کو جکڑ کر بیڈ پر گرا دیا۔ اس غیر متوقع سلوک سے آشا

ے ہوش جاتے رہے۔

تمہیں کیا ہوگیا وجے! وجے! —— تم سمجھتے کیوں نہیں؟ ——"

ئی، تڑپی، بھوکے شیر کے پنجوں میں پھنسے ہوئے شکار کی طرح پوری قوت سے مدافعت کے

ت ناکام ہوگئی۔ تو چاہا کہ وہ چلائے۔ زور سے چلائے۔ مگر رات کا سناٹا۔ ہوس کے نام پر دو..

ی خاموشی چھائی تھی۔

وجے! چھوڑ دو۔ ورنہ میں چیخوں گی۔ تم ہمارے پیار کی تذلیل کر رہے ہو وجے! ——"

"کون" آشا اپنے کمرے کے دروازے پر کسی کے قدموں کی چاپ کو محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا؟

'میں ہوں' ۔ ایک ۔ آواز!

'کون' ۔ آشا نے دوبارہ سوال کیا۔

'کہا نا ۔ میں ہوں!

" وجے!" آشا نے پوچھا

"کون وجے؟"

" وجے! کیوں بنارہے ہو مجھے ۔ بولو نا۔ تم ہی ہو نا ___ " آشا کے لہجے میں نرمی اور کچھ تجسس کا رنگ تھا۔

آشا اپنے کمرے میں اکثر دیر تک مطالعہ میں مصروف رہتی تھی۔ آج بجلی آف ہو گئی اور اُسے مجبوراً وقت

سے پہلے ہی بستر میں دبکنا پڑا تھا۔ خزاں کی ہلکی ہلکی خنک ہوا دریچوں سے اندر آرہی تھی۔ اور جلدی ہی

نیند کی دیوی نے آشا کو خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیا۔

اچانک کسی کی آہٹ سے وہ جاگ پڑی ۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ حیران سی ہوئی کہ

اس وقت " وجے" اُس کے پاس کیوں آیا ___

"ہاں آشا ۔ میں ہی بول رہا ہوں۔ دروازہ کھولو نا۔" اُس نے جواب دیا۔

"تم سوئے نہیں؟ بجلی چلی گئی ——"

آشا بستر چھوڑ کر اُٹھنے لگی ۔ "کیا کام ہے مجھ سے اس وقت ؟" وہ سمجھی شاید موم بتی یا ماچس مانگنے آیا ہوگا وجے ۔

"مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ۔"

کیا کہنا ہے تمہیں ۔ کل کہہ لینا ۔ میں سمجھی کہ ماچس چاہئے تم کو ۔ آشا نے آہستہ سے کہہ دیا ۔

"آشا ! دروازہ کھولو نا ذرا ——"

وہ غیر شعوری طور پر اُٹھی اور دروازہ کی کنڈی کھول دی ۔

وہ کھڑے کھڑے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس وقت وجے کو کیا ضروری کام آن پڑا ہے

"بولتا کیوں نہیں ۔" لیکن دروازہ کھولتے ہی وہ اندر آ گیا ۔

وہ گھبرا سی گئی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ۔ اُس نے چاہا کہ دیا سلائی کی ڈبیہ تلاش کرے وہ کس پر پڑا تھا ۔

"تم نہیں پوچھ سکتے تھے ۔ جو اس اندھیرے میں ——"

"مگر آشا ——" وہ اُٹھا اور اپنے بازوؤں میں آشا کو جکڑ کر بیڈ پر گرا دیا ۔ اس غیر متوقع سلوک سے آشا کے حواس بجا تے رہے ۔

"تمہیں کیا ہو گیا وجے ! وجے ! —— تم سمجھتے کیوں نہیں ؟ ——"

وہ کسمسائی ، تڑپی ، بھوکے شیر کے پنجوں میں پھنسے ہوئے شکار کی طرح پوری قوت سے مدافعت کے باوجود ناکام ہو گئی ۔ تو چاہا کہ وہ چلائے ۔ زور سے چلائے ۔ مگر رات کا سناٹا ۔ ہوسٹل کے تمام دار دو... میں خاموشی چھائی تھی ۔

"وجے ! چھوڑ دو ۔ وجے میں چیخوں گی ۔ تم ہمارے پیار کی تذلیل کر رہے ہو وجے ! ——"

اپنی گرفت کو اور مضبوط کرتے ہوئے اُس نے اُس کے ہونٹوں پر اپنے دہکتے لب رکھ کر بے بس لڑکی کو چُپ کرا دیا۔ اس کی آتما رسک رہی تھی، اس کا دل زخمی پنچھی کی طرح اُس کے معصوم سینے میں پھڑپھڑا رہا تھا۔

" آشا! میں جانتا ہوں، تم شور نہیں مچاؤ گی ــــ " اُس نے کہا۔

" وجے! ــــ " بمشکل آشا کہہ سکی اور اُس کا سانس پھول گیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا اُمڈنے لگا ــــ

"بھگوان کے لئے وجے! ــــ مجھے چھوڑ دو۔ میرے پیار کی مجھے سزا نہ دو۔ وجے! ــــ میں تمہاری آشا ہوں ــــ تمہاری! ــــ "

لیکن ایک بے بس و مجبور لڑکی کا شیشۂ عصمت چُور چُور ہو گیا۔ اور دبے پاؤں بغیر کچھ بات کئے وہ کمرے سے چلا گیا۔

دروازہ رات بھر کھلا آشا کی لُٹی ہوئی قسمت پر ماتم کرتا رہا اور آشا بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ وہ چاہتی کہ زور زور سے روئے۔ وجے! بھگوان کے روپ میں شیطان بھی ہو سکتا تھا۔ وہ خیالوں میں موازنہ کرنے لگی۔ ابھی وہ دُلہن نہ بنی تھی۔ ابھی اُس نے سولہ سنگار نہیں کئے تھے۔ ابھی بارات نہ آئی تھی۔ اُس کے ارمانوں کا شہزادہ ــ کیا اتنا پست اخلاق ہے۔ کیا اُسے پیار پر اعتماد نہ تھا ــــ ؟ وہ سوچتی رہی ــــ

صبح میں کالج کس طرح جاؤں گی۔ میری ماتا نے مجھ پر اعتماد کیا تھا۔ آج اُن کے وشواس کو ٹھیس لگی۔ یہ کیا ہوا۔ وجے! یہ کیا کیا تم نے؟ میں تو تم کو پوجتی تھی۔ وہ خیالوں میں اُس سے گلے شکوے کر رہی تھی۔

بڑے کرب و اضطراب میں رات کے تکلیف دہ لمحات بیت گئے اور بساطِ فلک بنارا

کی محفل مغموم و مضمحل آشا کے ارمانوں پر آنسو بہا کر بکھر گئی۔ بوجھل بدن کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا اور ساری رات کروٹیں بدل کر بتانے کے بعد وہ بستر سے اُٹھی۔ وہ آئینے کے مقابل جانے سے ڈر رہی تھی۔ ایک نامعلوم سا خوف ایک بے نام سی وحشت اُس کو گھیرے ہوئی تھی۔ چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا ——۔

دروازہ چوپٹ کھُلا تھا —— وجے کمرے میں داخل ہوا۔

"ہیلو! گڈ مارننگ آشا! ——" وہ حسبِ معمول مسکراتے لہجے میں بولا۔ آشا نے محسوس کیا کہ یہی دیو رات کی خاموشی میں کس طرح آہستہ آہستہ بدلی آواز میں چوروں کی طرح مجھے لُوٹنے آیا۔ اور صبح کو ہمیشہ کی طرح چمن کے کھِلے ہوئے پھول کی طرح مجھے چھیڑنے آیا۔ اس کی آنکھوں کے جام چھلک پڑے۔

"ارے! —— تم رو رہی ہو —— آشا!" وجے نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا

"کیا گھر کی فکر ستا رہی ہے۔ کل خط آیا تھا ——"

وہ سوچ میں پڑ گیا خط میں کیا لکھا ہوگا ایسا۔ آشا کیوں مغموم اور پریشان سی لگ رہی ہے آج۔

"مگر تم رو کیوں رہی ہو —— کیا تم رات کو سوئی نہیں آشا؟"

"آشا —— !

آشا۔!

وجے اس کے دل میں دبے ہوئے کرب کو کھوجنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن آشا کے چہرے سے بیزاری ٹپک رہی تھی۔ اُس نے منھ پھیر کر آنسو پونچھے اور صرف اُس کی طرف دیکھ کر "کچھ نہیں۔ ——" کہا۔

"نہیں نہیں میری آشا! —— تمہارے گلاب جیسے رخساروں پر یہ شبنم کی طرح ڈھلکتے ہوئے آنسو! —— مجھ سے کیوں چھپاتی ہو —— کیا بات ہے بولو نا ——؟"

وجے اس اچانک تبدیلی کے سبب کو جاننے کے لئے بے چین تھا۔ مگر ایک شانِ بے نیازی سے بغیر کچھ تو دیئے آشا باتھ روم میں چلی گئی اور وجے اس پہیلی کو بوجھنے میں الجھا رہا۔

آشا نے اپنے بال بھی نہیں سنوارے اور یونہی جلدی جلدی کپڑے بدل کر اپنی کتابیں سنبھالنے لگی۔

"یہاں کیا کر رہے ہو وجے؟"

"کیوں۔ آج۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو ——— نہ ناشتہ ــ نہ کچھ ——— کیا آج بغیر کھائے پیئے ہی جانا ہے؟ ———" وجے نے شوخی اور شرارت آمیز ہمدردی سے آشا کو گھورتے ہوئے کہا ———

"بس وجے ـــ بس۔ اب تو حد ہو گئی۔ نہ مجھ سے ناشتہ بنے گا نہ کھانا پکے گا۔ تم جانو اور تمہارا۔"

"مگر آشا! ———" وجے نے لجاجت سے پوچھنا چاہا۔ لیکن آشا نے نفرت آمیز انداز میں کہا "اچھا تم جا سکتے ہو وجے! ———"

"مگر ———!"

"مگر وگر میں کچھ نہیں جانتی۔ میں کہتی ہوں اب تم جا سکتے ہو ——— ورنہ ———"

وجے اٹھا اور آشا کی اس اچانک تبدیلی اور غیر اخلاقی سلوک پر دل شکستہ وہاں سے چلا گیا۔

سارے دن کالج میں وجے یہی سوچ رہا تھا کہ آشا ایک ہی رات میں اس قدر کیسے بدل گئی؟

——— کل شام کو تو وہ بہت اچھے موڈ میں ملی تھی مجھ سے ———

وہ آشا جو میرے سپنوں کی رانی، میرے ارمانوں کی دیوی، میرے جیون کی بہار ہے ———

کیا دور رہنے پر لاکر مجھے چھوڑ رہی ہے۔ میرے پتا جی، میری ماتا جی اُس کو دیکھنے اور اپنی بہو بنانے کے لئے کتنے بیتاب ہیں ——— مگر یہ کیا ہو گیا۔ رات کی رات میں دنیا بدل گئی ——— وہ سوچتا رہا ——— نہ تو لیکچر میں اس کا دل لگا نہ کلاس کے کسی کام نے اس کو دلچسپی رہی۔

وہ نڈھال اور مایوس سا چپ چاپ واپس ہوسٹل پہونچا تو چاہا کہ آشا سے پوچھے کہ اُس کے

بیوہ ماں نے بچپن سے جس کو اپنا جیون ساتھی بنانے کے منصوبے بنائے ہیں۔ اُس سے کیوں نفرت کے
شعلے ایک دم کیوں بھڑک گئے؟ ...... لیکن اب اس کا سامنا کرنے کی اس کی ہمت نہ تھی۔ اس کے
پاؤں اب آشا کے کمرے کی طرف بڑھنے سے معذور تھے۔ وہ کمرہ جس کو وہ اپنی آشاؤں کا مندر سمجھتا
تھا۔ اور جس کمرے کی معطر اور مقدس فضا میں ایک ایک سانس اس کی زندگی کا سرمایہ حیات ہوا کرتا
تھا مگر آج وہ فضا مسموم نظر آرہی تھی۔

دن گزرے، ہفتے گزرے، مہینے بیتنے لگے ـــــ آشا اب وجے سے کھچی کھچی دُور دُور
رہتی تھی۔ کبھی سامنا ہوتا تو یہ آنکھیں پھیر لیتی۔ آشا نے اپنے بدن میں ایک انوکھی سی تبدیلی محسوس کی اور
جس دن اُسے یہ پتہ چلا کہ اس کی زندگی کی اُس سیاہ رات کو اُس کی تقدیر کے اُجالے مٹا گئے ہیں اور اب
ایک کنواری لڑکی نہیں بلکہ ایک "کنواری ماں" بننے والی ہے۔ تو اُس کی روح مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے
لگی اور اس کے جگر میں ایک زہر آلود تیر سا چُبھ گیا، جس کا کرب اُسے ماہیٔ بے آب کی مانند بیقرار رکھنے لگا۔
کئی بار اُس نے سوچا کہ وہ وجے کو سب کچھ بتا دے۔ تاکہ اپنی لغزش اور بے صبری کے کردہ نتیجے
کا سماجی پہلو کے پیشِ نظر وہ جلدی سے اپنا لے۔ ورنہ ...... ! اسی ادھیڑ بُن میں کئی راتوں تک
وہ جاگتی رہی۔ کبھی خود کشی پر آمادہ ہوتی۔ کبھی وجے کے سلوک سے دل برداشتہ ہو کر اپنی پائیدار اور
سچی محبت پر افسوس کرنے لگتی۔ کبھی اپنی بے بسی اور مجبوری پر آنسو بہاتی ـــــ

آخرکار ہمت کر کے وہ وجے کے کمرے میں داخل ہوئی۔

وجے کے ذہن و دماغ پر آشا کی بے التفاتی سے غم اور حسرت کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور وہ ہر
وقت بُجھا بُجھا سا رہتا تھا کہ بادل چھٹ گئے اور بدرِ کامل کی نورانی جھلک کی طرح اُس کے کمرے کی
دُھندلی دُھندلی روشنی میں آشا ماہِ تاباں بن کر نمودار ہوئی۔

"آشا! ـــــ آشا!" ایک دم اس کی زبان پر آیا۔

"آشا ـــــــ ـــــــ" اور وہ سرو قد تعظیم حسن میں کھڑا ہو گیا۔

آشا کا مایوس و مغموم چہرہ غم و اندوہ کی داستان سُنا رہا تھا اور آنکھوں سے فکر و تردّد، اندیشہ ہائے دُور دراز کے آثار نمایاں تھے۔

مہینوں بعد آج آشا وجے کے پاس آئی تھی۔ اتنی مدت تک ہجر و فراق کی آگ میں جلا ہوا وجے اپنی آشا کی بے رُخی کے معمّے کو حل نہ کر سکا تھا۔ اور آج اس کو اپنا مہمان پا کر اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکتا تھا۔

اس نے جلدی جلدی برقی کیتلی میں چائے بنانے کا انتظام کیا اور خوشی میں پھولے نہ سماتے ہوئے بار بار آشا کی طرف دیکھتا جاتا۔

"چُپ سی کیوں ہو آشا؟ بولو نا" وجے نے شوخی سے کہا۔

"ہاں۔ تم کو اب میری چُپ کا سبب کہاں معلوم! ــــــ تم ہی نے تو میری خوشیاں لوٹ لیں وجے۔ آج کتنے بھولے بنے ہو ــــ" آشا کی آواز میں مایوسی تھی شکوہ تھا اور ناز و ادا کی شان بھی۔

"میں! ــــــ آشا۔ مجھے کیا دوش دے رہی ہو تم؟ ــــــ تمہاری خوشیوں کے لئے تو میں آسمان کے تارے توڑ لاؤں۔ تمہاری مانگ میں کہکشاں سجا دوں۔ تمہاری خوشی ہی تو میری زندگی ہے آشا!" چائے کی پیالی آشا کو پیش کرتے ہوئے وجے نے کہا۔

آشا کے ہونٹ تھرتھرانے لگے وہ کہنا چاہتی تھی کہ تمہارا دوش نہیں ہے تو میرے پیٹ میں کس کی امانت ہے اور اب میں سماج کو کیا منھ دکھاؤں گی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وجے کی بے نیازی اور بے پرواہی کا جائزہ لیتے ہوئے اس راز کو افشا کرنے کے لئے الفاظ ڈھونڈ رہی تھی لیکن الفاظ لبوں تک نہ آ سکتے تھے۔

"وجے! ــــ اب تم ــــ"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اُس کے ہاتھ کانپنے لگے پیالی ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی ۔ اُس نے سنبھلنا چاہا مگر بیٹھے بیٹھے ہی چکرا کر وہ بھی زمین پر آگری ۔ اس حالت کو دیکھ کر وجے جو خوشی میں جھوم رہا تھا ایک دم مبہوت و ساکت کھڑا کا کھڑا رہ گیا ۔ اُس کے پاؤں تلے زمین کھسکنے لگی ۔ گھبرا کر اُس نے آشا کے قریب آکر نبض دیکھی ــــــ

وہ پاگلوں کی طرح کمرے سے نکلا اور ہوسٹل کے ڈاکٹر کو بُلا لایا ۔

آشا کو پلنگ پر لٹا دیا گیا ۔ ڈاکٹر نے اسٹیتھسکوپ (STETHOSCOPE) لگا کر آشا کے دل کی دھڑکنوں کو جانچنا اور انگلی سے نبض کی رفتار کو گِننا شروع کیا ۔

" گھبرانے کی بات نہیں ۔ ابھی ہوش میں آجائے گی ــــــ " اُس نے آشا کو تیز خوشبودار سی کوئی چیز لوتل سے سُنگھاتے ہوئے کہا ۔ اور کورومین کا ایک انجکشن بازو میں لگانے کے بعد وجے سے پوچھا ۔

" یہ بتایئے ۔ آپ سے اس کا کیا رشتہ ۔ ہے ؟ "

وجے اس اچانک سوال سے سہما سہما سا ہو کر کہنے لگا ۔

" جی ــــ جی ہم دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے ہیں ۔ یہاں ہوسٹل میں الگ الگ رہتے ہیں ۔ یہ کچھ پوچھنے ابھی کتاب لیکر آئی تھیں ــــــ "

" آپ کا نام ــــ ؟ " ڈاکٹر نے پوچھا ۔

" جی ـــ جی وجے ۔ مجھے وجے کہتے ہیں ۔ فائنل میں پڑھتا ہوں ۔ " وجے نے گھبراتے ہوئے جواب دیا ۔

" وجے بابو ۔ اس PATIENT کے HUSBAND کہاں ہیں ۔ کیا آج کل یہ اکیلی ہیں یہاں ؟ "

سوالیہ نظروں سے وجے کی طرف دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے پوچھا ۔

" جی ۔ جی ۔ ڈاکٹر صاحب ۔ اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہے ۔ یہ ابھی ــــــ "

" کیا " ــــ ڈاکٹر نے حیرت آمیز نظروں سے وجے کے اس ادھورے جملے کو پورا کیا ۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ نے یہ بات کیوں پوچھی۔ یہ تو کنواری ہے"

"یوں ہی" ڈاکٹر نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ "یہ ماں بننے والی ہے۔ جی ہاں کنواری ماں ہی سہی۔" ڈاکٹر نے کچھ دوا دیتے ہوئے کہا کہ نسخہ پر لکھی ہدایات کے مطابق یہ ابھی دینا۔ ٹھیک ہو جائے گی گھبرانے کی بات نہیں ____

وجے کا سر چکرا گیا، دنیا نظروں میں گھومتی نظر آئی وہ کھڑے کھڑے دیوار سے ٹکرا گیا۔

"آشا نے آنکھیں کھولتے ہوئے آہستہ سے ____ یہ میں تمہارے بیڈ پر ____ وجے!" لب ہلائے۔

"ہاں آشا۔ تم FAINT ہو گئی تھیں ____ ڈاکٹر نے یہ دوائی دی ہے اور تمہاری نبض بھی دیکھی ____"

"نہیں ____ وجے ____ آج پھر کوئی ارادہ تو نہیں تھا۔" آشا نے نقاہت کے باوجود نفرت آمیز لہجے میں زور سے کہنے کی کوشش کی اور آنکھیں پھیر لیں۔

"آشا ____ ڈاکٹر نے کہا کہ ____ تم"

"یہی نا کہ میں ماں بننے والی ہوں ____" آشا نے جملہ پورا کر لیا۔

"مگر۔ آشا!۔ مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی ____"

"وجے یہ اُمید تو مجھے بھی تم سے نہ تھی۔ یہ تمہارا بچہ ہے۔ کاش اُس رات کو سوچا ہوتا کہ اگر ایسا ہو جائے تو ____ کتنی منت کی تھی میں نے ____" وہ غصہ اور انتقام کے جذبات پر قابو پاتے ہوئے سنانے لگی۔

"کیا تم بھول گئے۔ کیا میری آہوں اور آنسوؤں سے تم نے مجھ پر ترس کھایا اُس رات ؟ ____"

"آشا! ____ مجھے یہ الزام مت دو۔ میں نے تم سے پیار کیا ہے۔ تمہیں اپنی جان سے چاہا ہے۔

جیون بھر ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن مجھے نہیں معلوم کہ تم اپنے دامن پر داغ لگا کر اب مجھ پر ہی دوش رکھ رہی ہو۔ آشا!۔" وجے کی آواز بھرا گئی

آشا پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ وجے کی باتوں میں مردانہ وقار اس کی بے ریا محبت کی سچائی اور اپنے کرتوت پر نفرت اور ندامت کے بدلے غصہ کے آثار تھے۔ لیکن پھر کیا وجے کے علاوہ کوئی اور اس کے پاک بدن کو چھونے کی ہمت کر سکتا تھا۔ وہ چکرائی اور ایک دم حواس کھو گئی۔ اب کی بار دل کا شدید دورہ پڑا۔

"آشا۔ میں نہیں تھا۔ وہ میں نہیں تھا۔ جس کے جبر کی نشانی تم اپنے بدن میں لئے ہو۔ میری آشا یقین کرو اپنے وجے پر۔"

کچھ دیر بعد آشا ہوش میں آگئی تو وجے نے بات کا رُخ بدل دیا۔ وہ کالج کی باتیں کرنے لگے۔ باتوں ہی باتوں میں وجے نے پوچھا کہ اجے ــــ جس کے چہرے پر تم نے چپل ماری تھی نا۔ اُس نے ہماری محبت کے گلشن کو برباد کرنے کی دھمکی دی تھی ـــــ" وہ سُناتا رہا۔ "اور اب کئی مہینوں سے تم نے مجھ سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تو وہ بھی کھویا کھویا سا رہنے لگا ہے۔ یاد ہے اجے۔!"

"ہاں وہ کمینہ بدمعاش! ـــــ میں تو اُس کتے کی صورت سے بھی نفرت کرتی ہوں ـــ" آشا نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

"میں نے تمہارا سہارا لیا تھا اور بھروسہ کیا تھا کہ میرے جیون کی ڈولتی نیا کو کنارا مل گیا۔ مگر تم نے بھی مجھے کہیں کا نہ رکھا۔"

آشا! تم مجھ پر یقین کرو۔ میں تمہاری جوانی کی قسم کھا کر، اپنی محبت کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میں نے یہ پاپ نہیں کیا۔ کبھی نہیں کیا ـــــ شاید اجے ـــــ"

آشا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ خون کے آنسو پئے جا رہی تھی۔ پھر چکرا کر گر پڑی۔ ماتھے

پر پسینے پھوٹ نکلے۔ چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔
وجے نے اُسے پھر دوائی سنگھائی۔ تلوے سہلانے لگا۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دئے۔ وہ ایک مرجھائے
پھول کی طرح وجے کے بازوؤں میں لٹکی رہی ——
مگر اب! ——
اب کیا کیا جا سکتا تھا ——
"ہاں آشا میں تمہارا سچا ہمدرد ہوں۔ تمہارا سچا ساتھی ہوں۔ تمہارے غم میں برابر کا شریک۔"
"اس بے گناہ آنے والے بچے کا نقلی باپ بن جاؤں گا۔ آشا۔" وجے نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔
"مگر کہاں تک —— یہاں سارا کالج جانتا ہے کہ ہم دونوں دوست ہیں۔ اور ایک دوسرے
سے پیار کرتے ہیں۔"
"چلو کہیں بھاگ چلیں پھر ——؟" وجے نے عزم واعتماد سے بے سہارا لڑکی کا ہاتھ تھامتے ہوئے
کہا
"مگر وجے! ہمارے گھر والے کیا سوچیں گے۔ کیا ہم نے اپنے خاندان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگانے کے لئے
ہی جنم لیا تھا ——"
نہیں وجے —— نہیں۔ تم اپنے بوڑھے باپ کا سہارا ہو۔ نہ معلوم کن اُمیدوں اور ارمانوں سے
اُنھوں نے تم کو پالا ہے پڑھایا ہے۔ تم اُن کو چھوڑ کر۔ کہاں سُکھ پاؤ گے۔ وجے! —— جانے دو مجھ
کو۔ میں ہی چلی جاؤں گی۔ اس سنسار سے دُور۔ بہت دُور۔ جہاں ——"
نہیں آشا! میں تم کو اکیلے جانے نہ دوں گا۔ جہاں جاؤ گی۔ سائے کی طرح میں تمہارے ساتھ ہوں۔"
وجے نے کہا ——
"وجے! جذباتی نہ ہو —— سوچ لو۔ دنیا کیا کہے گی۔ میں بدنصیب پاپن ہوں۔ مجھے برباد ہونا

تھا ہونے دو۔ تم اپنا جیون تباہ نہ کرو ۔" ہمدردانہ لہجے میں آشا نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن آشا! تم نے تو جیون بھر ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میں تم کو کیسے چھوڑ دوں۔"

آشا کے مجروح دل کو سہارا ملا۔ وجے کی باتوں سے ڈھارس سی بندھی اور شام کو چھپ چھپاتے اپنا مختصر سا سامان ہوسٹل سے نکال کر کسی انجان سفر پر نکلے۔ جہاں اُن کو جاننے والا کوئی نہ ہو۔

دوسری صبح سارے کالج اور ہوسٹل میں یہ خبر پھیل گئی۔ آشا اور وجے بھاگ گئے۔

جتنے منھ، اتنی باتیں۔ جو بھی جس کے من میں آنا ان دونوں کے چال چلن، باہمی تعلقات آپس کی دوستی کے بارے میں کہنے۔ ہر زبان پر ان ہی کا چرچا تھا۔

اجے کا ضمیر اس کو تڑپا رہا تھا۔ وہ ان دونوں کے بھاگ جانے کے خبر سے بہت ہی گھبرا گیا۔ اس کا سکون اُجڑ گیا۔ وہ دماغی توازن کھو بیٹھا۔

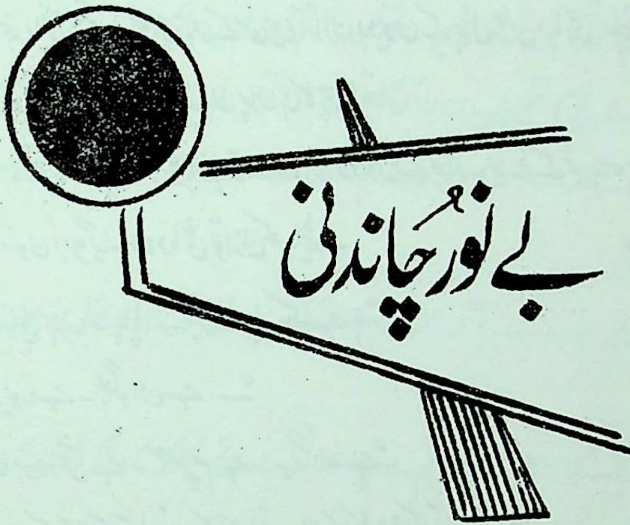
"میں پاپی ہوں۔ پاپی ۔ میں نے پاپ کیا ہے؟"

"وجے دیوتا ہے۔ بھگوان ہے ۔"

"آشا نردوش ہے۔ معصوم ہے۔ بے گناہ ہے۔"

بار بار اس کی آتما کی آواز اُس کو تڑپاتی ۔ اس کا کلیجہ منھ کو آنے لگتا تھا۔

پھر ایک دن۔ دوپہر کی تیز دھوپ میں پسینے میں شرابور اجے پاگلوں کی طرح آشا کے کمرے کی طرف دوڑا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ آشا کا پلنگ کھڑکی کے شیشوں سے اُس کے خطرناک گناہ کا بے زبان گواہ اپنی جگہ پر پڑا تھا۔ اجے نے کمرے کی دیوار کا سہارا لینا چاہا۔ اس کے قدم لڑکھڑائے اور وہ چکرا کر نیچے صحن میں آگرا ______ . تیسری منزل سے نیچے گر کر وہ زمین سے ٹکراتے ہی سرد ہو گیا۔


بے نور چاندنی

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ برآمدے میں بیٹھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں سے دل میں دہکتی آگ کو بُجھانے کی سعیِ ناکام میں مصروف تھی۔ قریب ہی دریا کا دلفریب منظر جاذبِ نظر لگ رہا تھا۔ جس کے روپہلے پانی میں تھرتھراتا چاند اور جھلملاتے تاروں کی آب و تاب میرے جذبات کے مدوجزر کا عکس بنے ہوئے مجھے خوابوں اور خیالوں کی دُنیا میں اُڑا رہے تھے۔ کبھی یہ روح افزا منظر میری رُوح کی بالیدگی اور خیالات کے عروج کا ایک سہارا ہوتے مگر آج ـــــ ....

یہ سب فطرت کا حُسن میرے لئے بالکل بے کیف تھا۔ میں ساکت و جامد تھی کبھی ماضی کے جھروکوں میں جھانکتی کبھی اپنی ناکام حیات کے اُن نقوشِ قدم کو ٹٹولتی جن سے دِل کی چُبھن اور احساس کا کرب اور زیادہ بڑھ رہا تھا۔ ساری فضا مغموم اور بے رونق سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی۔ کہ کس طرح مجھے لاڈ پیار میرے ناز بردار والدین نے اپنی آغوشِ محبت میں پالا۔ شفقت اور چاؤ سے میری پرورش کی۔ لیکن جب بچپن سے لڑکپن کی رعنائیوں کی منزل تک پہنچی تو ایسا لگنے لگا کہ میں اب اُن کی نظروں میں پھول کے بدلے کانٹا بن کر کھٹکنے لگی ہوں ـــــ تعلیم، کھیل کود اور گھر کی خدمت ایسے مشغلے تھے کہ کھیلتے کھیلتے یہ دَور گزرا اور اُن کا گذرنا بھی محسوس نہ ہوا ـــــ

ہائے جوانی کے دائرے میں قدم رکھنا ہی تھا کہ میری تقدیر اُجڑنے لگی۔ میری حیات ایسے گُلشن

کی مانند ہے جس پر عین بہار میں اولے پڑے ہوں ۔ اور اب میں ایک مسافر کی طرح جو اپنا سب کچھ لٹا کر واپس وطن کو لوٹنے پر تیار ہو ۔ حسرت و ارمان کا ہجوم سینے میں کروٹیں لے رہا ہے اور متاعِ حیات کے لٹ جانے کا غم ــــــ

ایسا کیوں ہوا ــــــ مجھے یاد آگیا اور اس یاد کے ساتھ ہی آنکھوں کے جام چھلکنے لگے ۔ میرے ابا جان سے امی کہہ رہی تھیں :۔

" لڑکی اٹھائیس برس کی ہوگئی ہے ماشاء اللہ فسٹ ڈویژن میں بی ۔ اے کر لیا ــــــ وہ آدمی کیا کہہ رہا تھا ــــ ؟"

ابا جان نے اخبار کو نیچے رکھتے ہوئے جواب دیا ۔" ہاں مجھے بھی وہ پسند ہے وہ بھی گریجویٹ ہے ۔ اور ٹیچر لگ گیا ہے ــــــ"

" جب پسند ہے یہ رشتہ ۔ تو کب تک جوان لڑکی کو گھر میں بٹھائے رکھیں گے ــــ" امی نے جواب میں کہا ۔ لیکن والد صاحب کے چہرے پر فکر مندی کے آثار اس بات کو سن کر اور گہرے ہو گئے ۔ بولے

" ٹھیک تو تھا مگر ــــــ"

مگر کیا ، آخر لڑکی پرایا مال ہوتی ہے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا ۔ امی نے شوق سے جواب دیا ۔

" وہ لالچی ہیں ۔ سکوٹر جہیز میں مانگتے ہیں اور تم جانتی ہو کہ میں تو ایک سائیکل بھی نہیں دے سکتا ۔ سکوٹر کہاں سے لاؤں ؟ ــــــ میں نے سوچا تھا کہ لڑکی کو تعلیم یافتہ بنایا ۔ مگر سماج زیورِ علم کے نہیں بلکہ طلائی زیورات کا دلدادہ ہے ــــ تم ہی بتاؤ نجمہ کی ماں ۔ اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے ؟ "۔

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب کر امی کو تسلی دینے لگے ۔ امی جان بھی ان باتوں سے غمگین سی ہونے لگی ۔ " یہ تو میں بھی سمجھتی ہوں لیکن ۔ آخر سماج میں رہنا ہے ۔ لڑکی کا کچھ نہ کچھ تو انتظام کرنا ہے ۔

دنیا والے کیا کہیں گے [illegible]

شادی کے وقت میں [illegible]

"بیگم میرے دل پر بھی [illegible]

کتنے ہی رشتے آئے مگر — " [illegible]

کا رنگ تھا۔ اُن پر سکتہ سا طاری ہونے لگا۔ [illegible]

کہنے لگے۔ "قرض لے کر میں اپنی بیٹیاں کے ہاتھ پیلے کر دیتا۔ [illegible]

ہو گی۔ سود بڑھتا جائے گا۔ اور پھر اگر ادا نہ کر سکوں تو — " ان کی آنکھوں [illegible]

میں اپنے چاہنے والے والدین کی باتیں سُن کر [illegible] کڑھتی رہی۔ کیا میرا ہی وجود میرے شفیق ماں باپ

والوں کی بے چینی اور بے آرامی کا سبب بنا ہے۔ مجھے کبھی سماج کی ان مکروہ رسموں اور کبھی اپنے آپ

ہی سے نفرت ہونے لگی۔ وہ رات [illegible] گزری۔ صبح کی بوجھل آنکھوں سے رات

کی بیداری [illegible] تھکان سی محسوس کر رہی تھی۔ لیکن نماز سے فارغ ہو کر

جب ہم چائے پینے بیٹھے [illegible] بے چینی کو ظاہر ہونے نہ دیا۔ لیکن مجھے ایسا لگ

رہا تھا کہ میں بہت بد نصیب [illegible] ماں باپ کے سکون اور آرام کو لوٹنے کے لئے دنیا

میں آئی ہے۔ [illegible]

بن گئی۔

[illegible]

جیسے لوگ [illegible]

میرے والد [illegible]

میں نے دیکھا [illegible]

کی مانند ہے جس پر عین بہار میں اولے پڑے ہوں ۔ اور اب میں ایک مسافر کی طرح جو اپنا سب کچھ لٹا کر واپس وطن کو لوٹنے پر تیار ہو ۔ حسرت و ارمان کا ہجوم سینے میں کروٹیں لے رہا ہے اور متاعِ حیات کے لٹ جانے کا غم ———

ایسا کیوں ہوا ——— مجھے یاد آگیا اور اس یاد کے ساتھ ہی آنکھوں کے جام چھلکنے لگے ۔ میرے ابّا جان سے امّی کہہ رہی تھیں :۔

" لڑکی اٹھائیس برس کی ہوگئی ہے ماشاءاللہ فسٹ ڈویژن میں بی ۔ اے کر لیا ——— وہ آدمی کیا کہہ رہا تھا ——؟"

ابّا جان نے اخبار کو نیچے رکھتے ہوئے جواب دیا ۔ "ہاں مجھے بھی وہ پسند ہے وہ بھی گریجویٹ ہے ۔ اور ٹیچر لگ گیا ہے ———"

" جب پسند ہے یہ رشتہ ۔ تو کب تک جوان لڑکی کو گھر میں بٹھائے رکھیں گے ———" امّی نے جواب میں کہا ۔ لیکن والد صاحب کے چہرے پر فکر مندی کے آثار اس بات کو سن کر اور گہرے ہو گئے ۔ بولے

" ٹھیک تو تھا مگر ———"

مگر کیا ، آخر لڑکی پرایا مال ہوتی ہے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا ۔ امّی نے شوق سے جواب دیا ۔

"وہ لالچی ہیں ۔ سکوٹر جہیز میں مانگتے ہیں اور تم جانتی ہو کہ میں تو ایک سائیکل بھی نہیں دے سکتا ۔ سکوٹر کہاں سے لاؤں ؟ ——— میں نے سوچا تھا کہ لڑکی کو تعلیم یافتہ بنایا ۔ مگر سماج زیورِ علم کے نہیں بلکہ طلائی زیورات کا دلدادہ ہے ——— تم ہی بتاؤ نجمہ کی ماں ۔ اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے ؟"۔

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب کر امّی کو تسلی دینے لگے ۔ امّی جان بھی ان باتوں سے غمگین سی ہونے لگی ۔ " یہ تو میں بھی سمجھتی ہوں لیکن ۔ آخر سماج میں رہنا ہے ۔ لڑکی کا کچھ نہ کچھ تو انتظام کرنا ہے ۔

دنیا والے کیا کہیں گے؟ کب تک لڑکی کو بٹھائے رکھیں گے۔ جب تک جوانی ڈھل جائے۔ ہماری شادی کے وقت میں تو چودہ برس کی تھی اور نجمہ تو ــــــ"

"بیگم میرے دل پر بھی بار ہے لیکن میری اس بے بسی پر خدا کو بھی رحم نہیں آتا۔ دنیا والے کیا ترس کھائیں گے۔ کتنے ہی رشتے آئے مگر ــــــ" والد صاحب کی آواز میں دل کی دنیا کے ایک ہلچل اور اضطراب کا رنگ تھا۔ اُن پر سکتہ سا طاری ہونے لگا۔ اپنی بات کو اسی غم ناک لہجے میں جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے۔ "قرضہ لے کر میں اپنی بٹیا کے ہاتھ پیلے کر دیتا۔ یہ بوجھ ہلکا ہوتا مگر پھر قرضے کی رقم ادا کیسے ہو گی۔؟ سود بڑھتا جائے گا۔ اور پھر اگر ادا نہ کر سکوں تو ــــــ" اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

میں اپنے چاہنے والے والدین کی باتیں سُن کر وہیں کھڑی رہی۔ کیا میرا ہی وجود میرے شفیق پالنے والوں کی بے چینی اور بے آرامی کا سبب بنا ہے۔ مجھے کبھی سماج کی ان مکروہ رسموں اور کبھی اپنے آپ ہی سے نفرت ہونے لگتی۔ وہ رات کانٹوں پر کروٹیں بدلتے گزری۔ صبح کی بوجھل آنکھوں سے رات کی بیقراری ٹپک رہی تھی۔ سارے بدن میں تھکان سی محسوس کر رہی تھی۔ لیکن نماز سے فارغ ہو کر جب ہم چائے پینے بیٹھے تو میں نے بزرگوں پر اپنی کسی بے چینی کو ظاہر ہونے نہ دیا۔ لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں بہت بد نصیب لڑکی ہوں جو اپنے ماں باپ کے سکون اور آرام کو لوٹنے کے لئے دنیا میں آئی ہے۔ سوچتی رہی کہ مجھے نازوں سے پالا، پڑھایا اور میں سکھ کے بدلے اُن کے دُکھ کا سبب بن گئی۔

اس واقعہ کے بعد سے میں اُداس اُداس سی رہنے لگی کسی بھی کام میں دل نہ لگتا تھا۔ شادی جسے لوگ مسرت اور آبادی سمجھتے ہیں میرے لئے بربادی ہے جب اس شادی کی وجہ سے میرے ماں باپ کی راتوں کی نیند اُڑ جائے ــــــ

میں نے فیصلہ کیا کہ میں کہیں سروس تلاش کروں گی اور اپنے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائی کا سہارا

بنوں گی۔ شادی ـــــــ میں کبھی شادی نہ کروں گی۔ یہ خیال آتے ہی میرے دل میں ہوک سی اٹھتی۔ دل سُلگنے لگتا تھا ـــــــ

ایک دن میں ایسے ہی خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی کہ امّی جان نے آکر میرے شانوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

" نجمہ! کیا بات ہے" میرے آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اپنی زندگی کی بھیانک تصویر وں کو خیالوں میں سجا بنا کر میں خود ہی مٹاتی اور اپنے اچھوتے ارمانوں پر بے اختیار آنسو بہارہی تھی۔ مجھے نہ اپنا ہوش تھا نہ ماحول کا ـــــ میں چونک پڑی " کچھ نہیں امّی! ـــــ" میں نے بناوٹی مُسکراہٹ سے اپنے غم کو چُھپانے کی سعی کی۔

" نہیں! تم کچھ کھوئی کھوئی سی لگ رہی ہو۔ ہاں۔ یہ تمہاری پلکیں کیوں بھیگ رہی ہیں بیٹا! ؟"

" کچھ نہیں امّی! میں نے آج ایک ڈراؤنا سپنا دیکھا۔ اسی خیال سے گھبراتی سی ہوں ـــ"۔ میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی ـــــ

امّی جان نے میری معصومیت اور سادگی پر ایک قہقہہ سا لگایا مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور بول اٹھی۔

" امّی! میں شادی نہیں کروں گی"

یہ جواب امّی جان نے سُنا تو اُن کی محبّت بھری آنکھیں کُھلی کی کھُلی رہ گئیں۔ وہ میری زبان سے ایسی بات سُننے کی توقع نہیں رکھتی تھیں۔ اُنھوں نے آہستہ سے میرے مُنھ پر ایک طمانچہ رسید کیا۔

" لڑکیاں ایسی باتیں نہیں کرتیں ہیں۔ کیا پڑھ لکھ کر تم نے یہی سیکھا ہے؟ چُھپ رہ۔ کیا خواب دیکھا تم نے؟ جو یہ پاگل پن کی باتیں زبان پر لاتی ہو"

میں امّی جان کی طرف آنکھیں اٹھانے کی ہمّت نہ پارہی تھی ہونٹ کانپنے لگے۔ سارا بدن پسینے میں شرابور ہوگیا۔ میں اٹھی اور دوسرے کمرے میں جاکر چپکے چپکے بہت دیر تک روتی رہی۔ میں کسی طرح

اُنہیں سمجھاؤں کہ میں شادی نہ کرنے کا عزم کر چکی ہوں۔

حالات کے تقاضوں سے، اپنی مجبوریوں کے دباؤ سے یا شاید میرے انکار کی وجہ سے ماسٹر جی کے پیغام کو ٹھکرا دیا گیا۔ مگر کرائے کے مکان اور جوان کنواری لڑکی کے لئے ہزاروں خواہش مند خریداروں کی آنکھیں للچاتی رہتی ہیں۔ پھر دوسری جگہ سے پیغام آیا ـــــ....

ایک دن شام کے وقت ابا جان نماز سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ امّی نے پھر میرا ذکر کیا۔

ابا جان نے کہا۔ ہاں دوسری جگہ بات طے کر لینا مجھے پسند ہے۔

"لیکن نجمہ تو ضد کرتی ہے اور شادی ہی سے انکار کر رہی ہے۔" امّی نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا۔

"وہ کونسی ایسی سمجھدار لڑکی ہے کہ اپنے متعلق کچھ رائے قائم کر سکے۔ اور ہاں لڑکے کی پہلی بیوی مر گئی ہے صرف تین بچے ہیں اُس کے ـــــ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں۔ آباد ہو جائے گی ہماری بیٹی وہاں۔" والد صاحب کہہ رہے تھے۔

امّی نے جب سُنا کہ وہ تین بچوں کے باپ کو میرا دولہا بنانے کے لئے کہہ رہے ہیں تو پوچھا

"اچھا عمر کیا ہوگی اُس لڑکے کی؟ ـــــ"

"یہی چالیس برس ـــــ اصلی بات تو یہ ہے کہ وہ کوئی جہیز نہیں مانگتا۔ بلکہ کچھ رقم اُدھر سے ہی دینے کو تیار ہے۔ جس سے ہم شادی کا انتظام کر سکیں گے۔

"ویسے دولہا دولہن سے چار پانچ برس زیادہ ہی عمر کا ہوتا ہے یہ لڑکا بارہ تیرہ برس زیادہ ہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔" والد صاحب متانت اور سنجیدگی سے امّی کو سمجھا رہے تھے۔

میں نے جب یہ باتیں سُنیں تو میری حالت غیر ہو گئی۔ مجھ پر بجلی سی گری۔ میرے ارمانوں کے گلشن میں ایک خزاں کی آندھی چلنے لگی۔ میرا سودا ہو گیا ہے۔ میں بیچ دی گئی ہوں۔ والدین نے ایک بے زبان لڑکی کی زندگی کا سودا طے کر لیا ہے۔ میں بِک گئی ہوں۔ میں تین بچوں کی کنواری

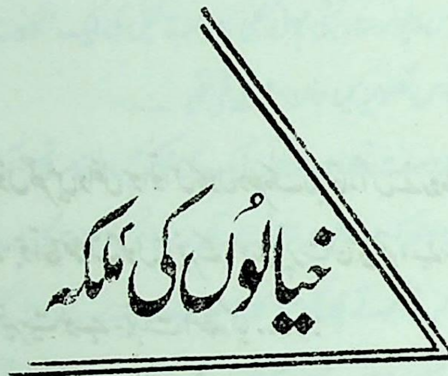
مار بن کر دُلہن بنائی جاؤں گی۔ وہ جو تین بچوں کا باپ ہے۔ جس کا شباب ڈھل چکا ہے۔ میں ایکی بیٹی اپنے والدین پر اتنا بوجھ بن گئی تو وہ دو بیٹیاں ـــــــ ؟

وہ مجھے خرید کر لے جائے گا۔ میں سوچتی رہی اور اس کے بعد ـــــــــــــــ ۔۔

"نہ کبھی میرے دروازے پر پالکی آئی نہ شہنائیاں بجیں۔ میں نے خواب آور گولیاں کھالیں۔ میرے لبوں پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ تھی۔ جو سماج کے ان فرسودہ رسم و رواج کے خلاف، ایک خاموش بغاوت کا اعلان جنگ تھا۔"

کب تک معصوم جانیں ایسے رسوم کی صلیب پر چڑھائی جائیں گی۔ میں نے اپنی موت پر رونے والوں اور اپنی جوانمرگی پر ماتم کرتے والوں کے لئے یہ سوال اپنے معصوم خون سے لکھ کر رکھ دیا ـــــ

-


خیالوں کی ملکہ

وہ دبے پاؤں گھر میں داخل ہوا تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اُس نے رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر قدم بڑھایا تو اُمّی نے، جو آج خلافِ معمول تاخیر کے باعث پریشان سی تھی، بے ساختہ پکارا:۔

"بیٹے اتنی دیر! خیریت تو ہے۔ بہت انتظار کیا ...."

ممتا بھری فکر مند آواز کے جواب میں شکیل معذرت پیش کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔ اُس کی زبان خشک ہوگئی تھی۔ اور چہرے سے تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ وہ اپنے دوست شمیم کے ساتھ پیدل آیا تھا اور اُس کے دل و دماغ پر نہ معلوم کتنے رنگین خیالات کے بادل چھائے تھے اور وہ اُس وقت بھی کوئی حسین سا خواب دیکھ رہا تھا کہ اُمّی کی آواز نے اُسے جھنجھوڑ سا دیا۔ وہ لجاجت سے بولا:۔

"ماں۔ آج بس نہ ملی۔ اس لئے دیر ہوگئی۔ کل دیر سے نہیں آؤں گا۔"

وہ کمرے میں داخل ہوا۔ کپڑے بدل لئے۔ کلنڈر پر نظر ڈالی۔ جس پر ایک نیم برہنہ حسینہ کا فوٹو تھا۔ جس کا توبہ شکن شباب دعوتِ نظر دے رہا تھا۔ یہ کلنڈر کئی ماہ سے اُس دیوار پر لٹکا تھا۔ مگر شکیل نے اُس تصویر کی طرف کبھی توجہ نہیں کی تھی۔ صرف ضرورت کے وقت تاریخ دیکھ لیتا۔

لیکن آج نہ معلوم کیوں اس تصویر کے انگ انگ سے ایک نشہ سا پھوٹتا محسوس ہونے لگا۔ شکیل اُس کو نزدیک سے دیکھ لینے کو دیوار کے قریب آیا۔ کاش یہ بول سکتی۔ بس آنکھوں میں آنکھیں ڈال

کر محبت کا عہد و پیمان باندھا تھا ـــــــ

امی کی آواز پھر آئی۔ وہ رسوئی میں اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔

شکیل نے ایک جھٹکے کی طرح ذہن کو ان خیالات سے آزاد کیا اور امی کی طرف جانے لگا۔ مگر جاتے جاتے ایک نظر اس تصویر پر اور ڈال دی ـــــ گویا مہینوں سے یہ حسینہ اُس کی بے اعتنائی کے باعث جامد و ساکت اور بے حس دیوار سے چمٹی ہوئی تھی اور اب شکیل کی ایک نگاہ سے اُس کی اُداسی مسکراہٹ میں بدلنے لگی تھی، اور اُس تصویر میں جان پڑنے لگی تھی ـــــ

شمیم، جو اُس کا عزیز دوست تھا اور دونوں ایک ہی محکمہ میں ملازم تھے، آج اُس کے ساتھ گھر تک پیدل آیا تھا۔ جان بوجھ کر وہ بس پر نہ چڑھے تھے۔ شام کا دُھندلکا ہو رہا تھا۔ دھوپ کی شدت کم ہو گئی تھی اور باتیں کرتے کرتے چھ کلومیٹر کا یہ سفر بڑے مزے سے کٹ گیا تھا۔

شمیم ایک سجیلا جوان، جس کے چہرے پر ہر وقت شوخی اور مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی ـــــ! مگر اب اتنا اُداس نظر آتا کہ ہر سانس آہ بن کر نکلتی۔ اور آنکھوں میں آنسوؤں کو ضبط کرنے کے باوجود بے اختیار چھلک پڑتے ـــــ!

آج وہ دل کے کنول کی طرح کھل رہا تھا اور بہار کی رعنائیوں میں جھوم رہا تھا۔ محبوبہ سے آج اُس کی ملاقات ہوئی تھی۔ جُدائی کے صدمے، گلے شکوے، پھر ملنے کے وعدے، نگاہوں میں مچلتے جذبات تھرتھراتے لبوں کا اظہار ـــــــ یہ مختصر سے لمحات شمیم کے لئے گویا مسرتوں کا خزانہ لٹاتے اور وہ خوشیوں سے دامن بھر کر اپنی محبوبہ کو رخصت کرتا تو اس کی اُمنگوں پر نکھار سا ہوتا۔ شکیل اس کا ہمراز تھا لیکن وہ شمیم کی اس دیوانگی پر مسکراتا اور طنز کرتا۔

"مانا کہ ایک خوبصورت سی گڑیا ہے یہ ـــــ تم سے دو منٹ بات کر لی تو کیا ہوا؟ تم کو کیا ملتا ہے کہ اس کے فراق میں آنسو بہاتے ہو، راتوں کو تڑپتے ہو۔ اور آج خوشی میں جھوم رہے ہو"

"شکیل تم کیا جانو یہ زمین کی رونقیں اور آسمان کی زینتیں، چاند کی چاندنی اور آفتاب کا نور، یہ پھولوں کی مہک اور شبنم کی پھوار، دنیا میں اگر کچھ ہے تو میری "شیلا" کے دم سے ہے۔" شکیل نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "شاید تمہاری نبضوں میں خون کی رفتار، تمہارے سینے میں دل کی دھڑکن بھی اُسی کے دم قدم سے ہو گی ـــ" اور پھر ایک زور دار قہقہے کے ساتھ شمیم کی گردن پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ـــــ "اچھا چلو میرے قیس، میرے فرہاد ـــ میں نے دیکھا ہے تمہاری لیلیٰ، تمہاری شیریں کو ـــــ"

شمیم جذباتی ہوا جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں شراب حُسن کا نشہ جھلک رہا تھا اُس کے قدم مستی میں ڈگمگا رہے تھے۔ جیسے کہ وہ میخانے سے خوب پی کر نکلا ہو ـــــ

"بدھو کہیں کے۔ تم کیا جانو محبت، وفا اور خلوص کس چڑیا کا نام ہے؟ حُسن اور عشق، ساری دنیا تو اسی محور پر گھوم رہی ہے۔ خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میری زندگی اُداس، میرا جیون اُجاڑ تھا۔ جب تک یہ سُندرتا کی دیوی میرے من مندر میں نہ سما گئی تھی۔ آج اپنی حیات کے ہر موڑ پر، اُسی کے سہارے ہر تلخی کو شیریں، ہر دُکھ کو سُکھ بنا لیتا ہوں ـــ"

شکیل، ارسطو کی طرح اپنے ساتھی کی بہکی بہکی باتوں کا توڑ فلسفہ کی ٹھوس حقیقتوں سے پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی نظر میں آج کا ہر نوجوان کسی نہ کسی محبوبہ کے عشق میں آوارہ، سماجی و اخلاقی تقاضوں سے غافل نظر آتا ہے اور محبت ایک فیشن بن گئی ہے۔ ہر اسٹیج پر "رومیو جولیٹ" کے ڈرامے کھیلے جا رہے ہیں۔ بڑی چڑ تھی۔ شمیم کی ایسی حرکتوں سے اُس کو ـــــ کیونکہ وہ اُس کا جانی دوست تھا۔

محبت ایک مقدس جذبہ ہے جو ہر انسان کے سینے میں ایک پاکیزہ امانت ہے۔ محبت کے حقدار اس کے بھائی بہن اور اس کی بیوہ ماں ہی تو ہے جن کی زندگی کا آسرا صرف وہ ہے۔

شکیل خیالات کی دنیا میں کھو گیا۔

کاش تمہیں کافرادا، رہزنِ صبر و قرار حسینہ مل جائے ؎

"میری طرح خدا کرے تمہارا بھی کسی پہ آئے دل

جگر پہ ہاتھ رکھ کے کہتے پھرو کہ ہائے دل"

یہ شعر شمیم نے اس طرح لہک لہک کے ACTION کے ساتھ سُنایا کہ شکیل ہنسی کو ضبط نہ کر سکا اور اُسے گمان ہونے لگا کہ شمیم سچ مچ پاگل ہوتا جا رہا ہے۔

"سنو! شکیل کاش کیوپڈ، اندھے کیوپڈ کے تیر کا نشانہ، تمہارے اس جوان سینے میں سویا ہوا پتھر کا ٹکڑا ——" شکیل کے سینے پر ایک بھرپور ہاتھ مار کر "یہ دل۔ یہ، بے حس دل بھی بن جائے —— آہا! پھر تم فراق کے مزے لوٹو، جُدائی کے صدمے اُٹھاؤ۔ تمہاری بھیگی پلکوں سے میں آنسو پونچھ کر تم کو دلاسا دوں۔ ہائے کیا لذّت ہے اُس بیقراری میں، کیسی مٹھاس ہے ہجرِ یار کی تپش اور تڑپ میں۔ میرے یار...."

"شمیم تم اپنے مخلص دوست کو ایسی بددُعا دے رہے ہو ع

خود تو ڈوبے ہیں صنم تمہیں بھی لے ڈوبیں گے

میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا —— یہ درد، یہ آزار، یہ خوشی، یہ مسرت، یہ دیوانگی اور یہ وحشت۔ خدا تمہیں ہی مبارک کرے اور اللہ مجھے اس آسیب سے بچائے۔"

جب کوئی پری تمہارے شیشۂ دل میں اُتر جائے گی تو خود ہی آسیب بھاگ جائے گا۔ وہ خونخوار ظالم اور مہیب آسیب جس کے شکنجے میں زندگی کے یہ بے کیف دن، عادی مجرم کو دی گئی قیدِ بامشقت کے سوا کچھ نہیں ——۔ شمیم کے لہجے میں کچھ ہمدردانہ اور مخلصانہ جذبات سے اُمنڈ آئے تھے۔

شکیل نے اپنے دل کے کسی گوشے میں ایک ہلکی سی میٹھی میٹھی کسک محسوس کی اور اس کے حافظے کے کنواس پر کچھ دھندلی دھندلی سی تصویروں کے خاکے اُبھر کر مٹ گئے۔

"رضیہ، کتنا پیار تھا اُسے مجھ سے۔ کتنی اپنائیت کا اظہار کرتی تھی وہ" ——— "رینو تو گویا میرا جیون بھر کا سہارا بننے پر آمادہ نظر آتی تھی ——— وہ مدبھری نگاہوں کا جادو، وہ رسیلی آوازوں کا سحر۔ مجھے مدہوش کر دیا کرتا تھا۔ وہ ہرنی کی چال والی نازک اندام لمبے لمبے سیاہ بالوں کو شانے پر بکھرائے خوشبوئیں بکھیرتی ہوئی رجنی۔ وہ بھی تو خاص ادا کے ساتھ میری طرف دیکھتی تھی"

کولھو میں جکڑے ہوئے بیل کی مانند میں اپنی تھکا دینے والی جدوجہد میں کبھی ایک لمحہ سکون نہ پا سکا۔ کیسا سپاٹ اور بے رنگ گزرا ہے میرا ماضی۔ میں نے کالج میں بھی کسی لڑکی کو لفٹ نہ دی۔ میں نے کسی دوشیزہ کو RESPONSE نہیں دیا۔ آج میں ——— بس۔ ایک مشین ہوں اور کتنا خوش نصیب ہے یہ شمیم"

شکیل اسی سوچ میں ڈوبا خلاؤں میں گھوم رہا تھا۔ اور شمیم کبھی اُس کا ہاتھ تھامتا، کبھی بڑے بڑے ڈگ اُٹھاتا۔ شکیل کے سُست قدموں میں تُندی اور تیزی بھرتے ہوئے اس کو اپنی طرف کھینچ کر آگے بڑھاتا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟ مجھ سے کیا چُھپاتے ہو یار؟ یاد آ گئی کسی کی؟" شکیل نے محسوس کیا کہ جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ شمیم نے اس کے دل کے آئینے میں جھانک کر کہیں "رضیہ۔ رینو یا رجنی کی تصویر تو نہیں دیکھ لی۔" وہ جھینپ سا گیا۔ اور دل کی بات چھپاتے ہوئے بناوٹی انداز میں بولا۔

"کچھ نہیں۔ دیر ہو رہی ہے۔ امی نہ جانے کیا سوچتی ہوں گی۔ نسیمہ کا اگیزام 'EXAM' بھی چل رہا ہے نا۔ وہ انتظار کر رہی ہو گی"

گھر کے نزدیک شمیم نے رخصت چاہتے ہوئے شکیل کے ہاتھ کو اتنی زور سے بھینچا کہ وہ چیخ

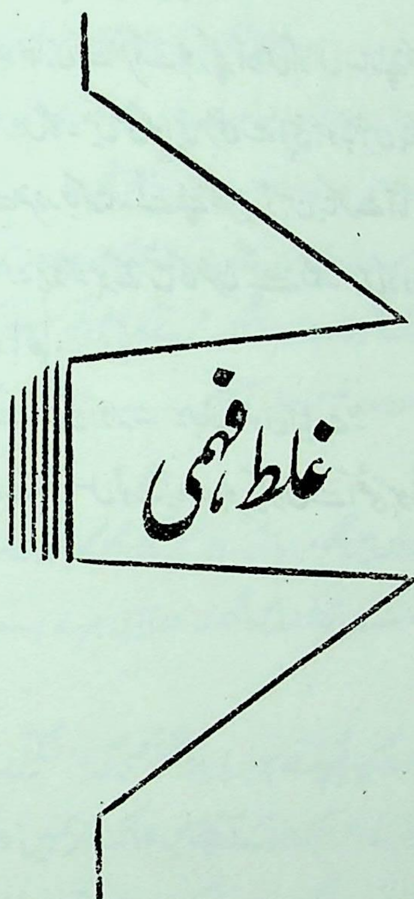
پڑا اور شرارت آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے شمیم بائی بائی مائی ڈیر۔ وِش یُو گڈ لک ...... " کہتا یہ جا وہ جا ہوا ____

مگر شکیل کے قدم کچھ بھاری سے نظر آئے اور کچھ اُداس اُداس سا اپنے مکان کے صحن میں داخل ہوا۔

" میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں کسی کو اپنی مرضی سے اپنی محبوبہ نہیں بناؤں گا۔ نہیں ؟ اگر میری محبوبہ ہوتی تو میں اُسے ضرور ملا کرتا۔ اُسے اپنے گھر میں دُلہن بنا کر لے آتا۔ میری ماں کی جگہ وہ میں میرا انتظار کیا کرتی ___ وہ پروانہ ہو کے شمع کی طرح پگھلنے لگا۔ اس کا دل و دماغ ان گنت سوالوں کا جواب طلب کر رہا تھا۔

" شکیل ______ ماں کی آواز ___ نہ جانے کون آیا ہے"۔

شکیل کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا اور بحرِ بیکراں سے اُٹھتی ہوئی موج ساحل سے مل نہ پائی۔


غلط فہمی

تم چلی جاؤ اس گھر سے ۔ میں نے کہا نا ۔ اب اس گھر میں تمہارے لئے جگہ نہیں ہے“۔ عادل کے لہجے میں نفرت تھی غصّہ تھا۔

شبنم کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑیاں بھی عادل کے دل کو نرم نہ کر سکیں ۔ وہ اپنے فیصلے پر اٹل تھا۔

”کیا تم چاہتی ہو کہ تمہارا منہ کالا کر کے گھر سے نکالا جائے ۔ کیا تم رسوائی کی منتظر ہو۔ جاؤ میکے تمہارے گناہوں پر، تمہارے سیاہ کرتوت پر پردہ رہ جائے گا۔ نکلو یہاں سے ۔“ وہ اصرار کرتا رہا۔

شبنم عجیب ذہنی کشمکش میں تھی وہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ اس کا کیا قصور تھا۔ اس کا کردار بے داغ تھا اس کی جوانی اس کے نام کی طرح بالکل معصوم اور اچھوتی تھی۔ آج کس لغزش کی سزا اُسے دی جارہی تھی جبکہ کبھی بھی اُس کے قدم جادۂ حیات پر نہیں ڈگمگائے تھے۔ اُس کا سرتاج آج کس ناکردہ گناہ کی پاداش میں اُسے اپنی نظروں سے دُور دھکیل رہا تھا۔ وہ سسکیاں بھرنے لگی ۔ روتے روتے اُس کی نرگسی آنکھیں سُرخ ہو گئیں ۔ اُس نے ایک نظر سے اپنے رفیقِ حیات کو دیکھا، ان نظروں میں رحم کی التجا تھی مگر سنگدل عادل کے پاس رحم کی جگہ نفرت کی آگ تھی ۔ اُس کی آواز شعلے برسا رہی تھی اور شبنم کے نازک دل پر اُس کا یہ بے مروتی کا سلوک زہر بھرے تیر چلا رہا تھا۔

وہ اپنا گھر چھوڑ کر کس طرح جائے ۔ حسرت بھری نگاہوں سے اپنے شوہر کو دیکھتی رہی ــــــ

گہرے سرمئی رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے اور مدھم روشنی پھیلانے والا سورج مغرب میں پہاڑوں کی اوٹ میں چھپ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کے موتی اس کے رخساروں پر ڈھلنے لگے۔

"شرم کرو شبنم۔ میں بچہ نہیں۔ ان پڑھ نہیں کہ مجھے تم فریب دے کر اپنے گناہ میں شریک بنا سکو۔ میں نے تم کو بھی کہا تھا کہ میں کسی بچے کا باپ بننے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ دس سال تک اس جھنجھٹ سے آزاد رہنے کے لئے میں نے آپریشن کرا لیا تھا۔ تمہیں گھر لانے سے پہلے ہی ــ پھر یہ پاپ کا بوجھ تم میرے سر کیسے لاد سکتی ہو شبنو! ـــــ جاؤ اور اپنی چڑیل ماں کو شیشے میں اُتار دو جو تمہاری پاکدامنی کی قسمیں کھا کھا کر دنیا کو بتائے گی کہ میری بیٹیا بڑی بھولی بھالی، معصوم اور عفیفہ ہے ـــــ" عادل نے تیز لہجے میں ذرا نرمی پیدا کر کے شبنم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میرے سرتاج! ـــــ" اس کی ہچکیاں سی بندھ گئیں۔ "آپ کو مجھ سے اتنی سخت بدگمانی!!" عادل کا ایک ایک لفظ اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اُتر رہا تھا۔ اس کا سر گھوم گیا۔ آتش فشاں کا سا لاوا سینے میں کھولنے لگا اُس نے ایک آہ بھری اور دھڑام سے گر پڑی۔

اتنے میں عادل کی بہن خورشیدہ کمرے میں داخل ہوئی اور بھابی کو زمین پر بے ہوش پڑا دیکھ کر گھبرا گئی۔ دوڑی دوڑی وہ پانی کا گلاس لائی۔ اور پانی کے چھینٹے دے کر بھابی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ بھائی کی طرف استفسارانہ نگاہ سے اس حادثے کا سبب معلوم کرنا چاہتی تھی۔

عادل نے بہن کو ہٹا کر خود شبنم کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور اس کی آنکھیں کھول کر، اُس کے بالوں کو سہلا کر، فکرمند نظروں سے اس کو دیکھنے لگا۔ خورشیدہ پائنتی بیٹھی بھابی کے پاؤں دابنے لگی۔ تھوڑی دیر میں شبنم نے آنکھیں کھولیں اور پھر بند کر لیں۔ پھر بازوؤں میں حرکت سی ہوئی اور

آہستہ آہستہ غشی میں افاقہ ہوا تو وہ انگڑائی سی لے کر اٹھ بیٹھی۔ اپنے آپ کو عادل کی باہوں میں پاکر حیران سی رہ گئی۔ اُسے یہ سب کچھ سپنا سا لگ رہا تھا۔

" خورشیدہ دم بخود اس کھوج میں لگی تھی کہ یہ کیا ہوا، کیوں ہوا۔" بھابی! صحت ٹھیک ہے نا تمہاری؟ ——"

شبنم نے خورشیدہ سے نہایت سنجیدگی اور متانت سے کہنا شروع کیا" بہن! اس معصوم اور بے گناہ کی قسم جو میری کوکھ میں جنم لے رہا ہے۔ بہن! میں بے گناہ ہوں۔ یہ تمہارے بھائی کی امانت ہے۔ مگر ——"

بھیا! —— یہ میں کیا سُن رہی ہوں! ——" خورشیدہ نے ذرا مایوسی اور بے بسی کے عالم میں پوچھا —— " شبنم ماں بننے والی ہے بھیا —— ؟"

'ہاں' —— عادل نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

خورشیدہ کی مسرت بھری مسکراہٹ اور شبنم کے رخساروں پر نسوانی حیا کی سُرخی نے عادل کے مردانہ غرور کو توڑ دیا۔

خورشیدہ ناچتی ہوئی دوڑی دوڑی مٹھائی لائی اور بھابی اور بھیا کا مُنھ میٹھا کر کے مبارک باد دینے لگی۔

لیکن عادل اپنی بہن اور بیوی دونوں کو خوفناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بدگمانی کی آگ اُس کے سینے کو بھڑکا رہی تھی۔ اور دھکے دے کر ایسی عورت کو گھر سے نکال دینا چاہتا ہے جس نے اُس کے اعتماد کے آبگینے کو چُور چُور کر دیا تھا۔

"بہن! تمہیں کیا معلوم ——" عادل نے اپنا اضطراب چھپاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں بھیا سمجھ گئی۔ جبھی تو بھابی کہہ رہی تھی۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے اس بے گناہ کی

قسم ——"

شبنم! میں غیر تو نہیں ہوں۔ تم ہی بتاؤ نا۔ بھیا کیوں بگڑ رہے ہیں۔ اس مبارک ساعت پر ایسی خوشی کی خبر پر یہ حالت!" وہ بھابی کی طرف مخاطب ہو کر بولی۔ بھائی اور بھابی دونوں کو چپ دیکھ کر وہ حیرانی سے دیکھتی رہی ——

کچھ سوچنے کے بعد عادل کی زبان کھلی "اچھا شبنم تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ ڈاکٹر کے پاس۔" شبنم سمجھ نہ سکی کہ ایسا کیوں ضروری تھا۔ مگر برقعہ اوڑھ کر وہ عادل کے ساتھ نکلی۔

"جلدی آجانا بھابی میں راہ دیکھ رہی ہوں ——" خورشیدہ نے کہا۔

جب وہ دونوں ڈاکٹر اجمل کے کلنک پر پہنچے تو عادل نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا آپ نے میرا آپریشن نہیں کیا تھا؟ ——"

"ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے شبنم کی طرف دیکھا اور پھر عادل سے کہا

ہاں! کیا بات ہے —— تم بھابی پر شک کر رہے ہو اب" پھر شرارت آمیز نظروں سے چھیڑتے ہوئے شبنم سے کہا۔ مٹھائی کھلاؤ بھائی! مبارک ہو ——"

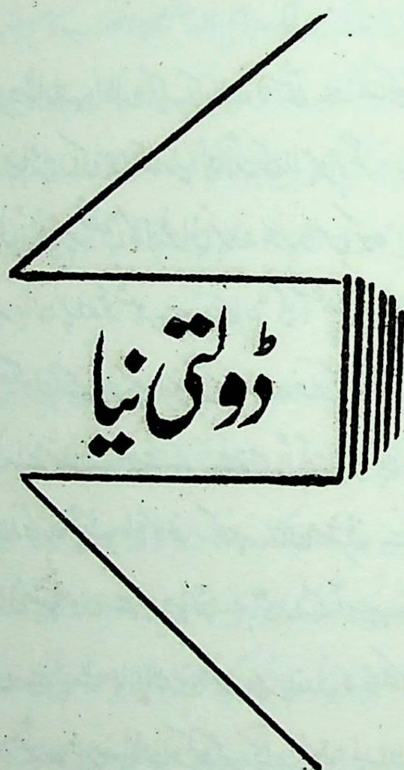
عادل کو غصہ آ رہا تھا مگر ضبط کرتے ہوئے اُس نے ڈاکٹر سے پوچھا

یہ کیا تماشا ہے —— یہ کہتی ہے کہ اُمید سے ہے۔ بتائیے کیسے؟"

ڈاکٹر اجمل ہنسی ضبط نہ کر سکا" مسٹر عادل! کیا میں کنوارے نوجوان کو STERILISE کرتا۔ میں نے تو تمہاری ضد پر تم کو یوں ہی بہلایا تھا —— ایک معصوم عورت پر شک نہ کرو ——"

دونوں کھل کھلا کر ہنسنے لگے اور عادل اپنی غلط فہمی پر شرمندہ، شبنم کا ہاتھ تھام کر گھر کی طرف لوٹا۔

—— ماضی کا پرندہ اپنے پر پھڑپھڑا رہا تھا۔


ڈولتی نیا

وادیٔ گل پوش کا سرسبز و شاداب نظارہ ایک کیف و مستی سے فضا کو مخمود کر رہا تھا۔ منتہائے نظر تک سرسبز اور نیلی پہاڑیوں کی لمبی قطاریں اور اُن کی ناہموار مگر سڈول آسمان سے باتیں کرتی ہوئی مخروطی چوٹیاں، مغربی اُفق پر شفق کا ارغوانی پردہ اور دامنِ کوہ میں دلکشا وادیٔ شادماں جس کی راحت بخش ہوا اور جان پرور خوشبو سے "ریحانہ" کی آنکھیں شاداب، دل شگفتہ اور دماغ معطر ہوا جا رہا تھا۔ دریا سکون کے عالم میں اپنی پُرتمکنت رفتار کو پورا کرتا ہوا۔ اور آسمان کے بدلتے رنگوں کی تصویریں اپنے شفاف سینہ کے آئینے میں اُتارتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ دلاویز نظارہ شبِ ماہ کا تھا۔ کوہستان مشرق سے ماہِ کامل نے اپنا سر اُٹھا کر وادیٔ تاریک کو اپنی نورانی شعاعوں سے بھر دیا تھا۔ پہاڑوں کے آسیب دار سایوں کا سمٹنا اور سمٹ کے ان کے دامنوں سے لپٹ جانا اور میدانوں پر چاندنی کا چھٹکنا، گویا کہ تاروں بھری رات زمین پر اُتر آئی تھی۔ ایسے جنوں خیز سامان دیکھ کر ریحانہ فرطِ انبساط سے اپنے آپ کو بھول گئی تھی۔ اس پُرکیف منظر نے ریحانہ کے دل پر اپنا تسلط جما دیا تھا۔ وہ اکیلی ان نظاروں میں کھو گئی تھی۔ اچانک وہ چونک پڑی۔ جب کہ باہر کسی کی کراہنے کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اُس نے سمجھ لیا کہ میرا سرتاج عمران ہی ہو گا۔ مگر سب بے سود......!

موسم خوشگوار تھا۔ اور بادِ صبا چل رہی تھی بادِ صبا کے ساتھ ساتھ کوئی خوشگوار بُو

اُس کے دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ جیسے کہ یہ بادِ صبا اُس کو خبر دینے آئی تھی کہ آپ کا محبوب آرہا ہے۔
عمرؔان کو آج گھر نہ آنے کو دوسرا دن تھا۔ وہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر مکان کے ورنڈے پر بڑی بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ اِسی اثنا میں کُرسی پر بیٹھ کر وہ کسی گہرے سوچ میں ڈوب گئی۔

عمرؔان کو اُس کے ساتھ بیاہے ابھی بمشکل ایک ہی سال گذرا ہوگا۔ کہ ایک عجیب واقعہ ظہور میں آیا۔ جو اُن کی متاہل زندگی میں ایک اہم اور سنگین انقلاب کا موجب ہوا۔ جب کبھی لمحاتِ فرصت میں وہ اپنے ماضی پر نگاہ ڈالتی۔ تو اُس کی تاریک فضا اُس جذباتی دنیا میں ہلچل پیدا کرتی۔ اور اُسکے جسم میں ایک پُر مسرت کپکپی سی پیدا ہو جاتی تھی۔ اُس کے سامنے زمانۂ ماضی اور حال دوزخ و جنت کے مناظر پیش کرتا تھا۔ اور وہ عالمِ انبساط میں اپنے آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ خوش قسمت ہستی خیال کرنے لگتی تھی۔

عمرؔان کو ریحانہ سے حد درجہ محبت تھی۔ اور وہ بھی عمرؔان کو اپنے تصورات میں ایک دیوتا سے کچھ کم نہ سمجھتی تھی۔ لیکن ایک بے نام سی خلش تھی جو اندر ہی اندر اُس کی تکلیف کا باعث بنتی۔ اُن دونوں کی طبیعتیں بہت حد تک مختلف واقع ہوئی تھیں اور یہی اختلافات کچھ مدت کیلئے اُن کی محبت کو پامال کر کے اُن کے روحانی اضطراب کا باعث بنا۔ ریحانہ کا شوہر عمرؔان فطرتاً سنجیدہ مزاج تھا۔ دُنیا کی دلچسپیوں سے اُسے کچھ لگاؤ نہ تھا۔ سوسائیٹی سے اُس کو نفرت سی تھی۔ وہ ہمہ تن اپنے کام میں مشغول رہتا اور جو وقت بچ جاتا۔ وہ مطالعہ میں صرف کر دیتا۔ یہی طرزِ زندگی اُس کے لئے دُنیاوی مسرت کا سبب تھی۔ اور وہ خوش خوش زندگی بسر کرتا۔ لیکن اُس کے برعکس ریحانہ نے نہایت چلبلی طبیعت پائی تھی۔ اُس کی نظروں میں سوسائیٹی کی بڑی وقعت تھی۔ مطالعہ کو وہ بھی پسند کرتی تھی۔ لیکن اُسے اتنی اہمیت نہ دیتی جتنی کہ عمرؔان۔ گھریلو دلچسپیوں سے ریحانہ کو کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ کھُلی فضا کے کھیلوں کا بے حد شوق تھا۔ ریحانہ کے دل میں تڑپ

تھی کہ شہر بھر میں ایک ہر دلعزیز اور ممتاز ترین عورت کی حیثیت سے رہوں۔ اس مزاجی اختلاف کے باوجود جو بیر۔ اُس کی تمام غلط کاریوں پر غالب آئی۔ جس نے اُنہیں گذشتہ زندگی کی تلخ کامیوں سے نجات دِلائی اور اُن کو متحد رکھنے میں کامیاب رہی۔ وہ عمرآن کی پاک اور بے لوث محبت تھی۔

عمرآن اپنے حلقۂ احباب میں ایک کامیاب ڈاکٹر مانا جاتا تھا۔ اور ہوتا بھی نہ کیوں۔ اسے اپنے پیشہ سے بہت دلچسپی تھی۔ ایک روز وہ ہنسی خوشی اپنے کام سے واپس آیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک تار تھا۔ مسرت سے دم پھُولا ہوا تھا۔ آتے ہی لفافہ ریحانہ کی طرف پھینک کر کہنے لگا۔ "ریحانہ" ——— میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ آج میرا عزیز ترین دوست جس کا عہدِ طفولیت میرے ساتھ بسر ہوا ہے یہاں پاور ہاؤس (POWER HOUSE) کے کام کی نگرانی کے لئے انجینیر کی حیثیت سے آرہا ہے۔ یہ کہتے ہی وہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں چلا گیا۔ اور ریحانہ خاموش ایک بُت کی مانند بیٹھی رہی۔ . . . . . .

امتیاز کے آنے کا وقت آگیا۔ ریحانہ، عمرآن کے ہمراہ اِسٹیشن پر اُس کا استقبال کرنے گئی۔ پتہ نہیں ریحانہ کا دل کیوں بلیّوں اُچھل رہا تھا۔ دِل میں ایک تڑپ تھی اور ایک نامعلوم جذبہ ریحانہ کو بیقرار و مضطر کر رہا تھا۔ عالمِ تصوّر میں امتیاز کی کبھی ایک شکل بنتی اور کبھی دوسری۔ آخر گاڑی آپہنچی اور ایک ڈبے سے ایک وجیہہ و شکیل جوان نِکلا۔ عمرآن کی طرح وہ بھی دراز قد اور متناسب اعضأ کا مالک تھا۔ لیکن اس کی بڑی بڑی آنکھوں اور خوبصورت گھونگھر والے بالوں نے اُس کے حسُن کو چار چاند لگائے تھے۔ عمرآن اپنے شفیق دوست کی طرف بڑھا۔ دونوں بڑے تپاک سے بغلگیر ہوئے اور ساتھ ہی ریحانہ کا بھی اُن سے تعارف کرایا۔ ریحانہ کی نگاہیں اُس کی نگاہوں سے ملتے ہی جھک گئیں اور ایک لہر بجلی کی رو کی طرح تمام جسم میں دوڑ گئی۔ گھر پہنچنے کے بعد متفرق موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں اور اسی اثنا میں عمرآن نے امتیاز کو اس بات پر مجبور کر دیا

کہ وہ اُنہی کے ہاں قیام کرے ......

وقت کا دھارا بہتا گیا۔ اور امتیاز گھر کے ممبروں کی طرح آزادانہ رہنے لگا۔ اُس کے خیالات بہت حد تک ریحانہ کے خیالات سے میل کھاتے تھے۔ اس وجہ سے ریحانہ اُس سے قریب ہوتی گئی۔ اُس کی موجودگی میں ریحانہ کچھ عجیب راحت محسوس کر رہی تھی۔ اور رفتہ رفتہ ریحانہ کو اُس کی محبت کا احساس ہونے لگا۔ ریحانہ نے اِس جذبہ کو نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے چھپائے رکھا۔ ریحانہ کو اپنے وفادار شوہر سے بے وفائی کا خیال ستاتا اور کبھی امتیاز کو گھر میں لانے کے لئے اُس کو کوستی۔ عمران کو ریحانہ کی اِس حرکت کا گمان تک بھی نہ تھا۔ وہ اُسکو ایک باعصمت اور وفادار بیوی کی حیثیت سے دیکھتا تھا۔ اِسی طرح دِن بیتتے گئے۔ ریحانہ سے جس قدر ممکن ہوتا امتیاز سے علیحدہ رہنے کی کوشش کرتی اور کبھی اکیلے نہ ملتی۔ صرف اِس ڈر سے کہ کہیں جذبۂ محبت غالب نہ آجائے اور ایک دوسرے پر اپنی اندرونی خلش کا اظہار نہ کریں۔ لیکن ۔ وائے قسمت جس بات سے گھبراتی تھی وہی پیش آئی۔

عمران کو دفتر کے کسی خاص کام کے سلسلے میں چند یوم کے واسطے دوسرے شہر جانا پڑا۔ اور نکلنے سے پہلے عمران نے امتیاز سے ایک بات کا وعدہ لیا۔ کہ وہ اُس کی غیر موجودگی میں بھی اُس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھتا رہے۔ عمران کے جانے کے بعد گھر میں اب ریحانہ اور امتیاز اکیلے رہ گئے......

عمران کی غیر حاضری میں اُن کا وقت اکثر ایک دوسرے کی صحبت میں گذرتا۔ دو محبت بھرے دِل کوشش میں رہتے کہ اپنے دِل کے جذبات کو چھپائے رکھیں۔ ریحانہ اِس خیال سے کہ عمران میرا جائز شوہر ہے اور میرا فرض ہے کہ اُس کے سوا کسی اور سے محبت کا نام ہی نہ لوں۔ اور امتیاز اِس جذبے کے زیرِ اثر کہ وہ اُس کے عزیز ترین دوست کی بیوی ہے۔ لیکن تقدیر کی بات

ٹالے نہیں ٹلتی ۔ ایک روز وہ دونوں سیر سے واپس آئے ۔ کمرے میں سوچ آن "SWITCH ON" کرنے کے لئے دونوں کے ہاتھ ایک ساتھ بڑھے ۔ ہاتھ سے ہاتھ ٹکرا گئے اور دم بھر میں ریحانہ امتیاز کی آغوش میں تھی ۔ ریحانہ کے لب اُس کے لبوں میں جذب ہو چکے تھے اور اُس کی گھبرائی ہوئی آواز ریحانہ کے کانوں میں کہہ رہی تھی ۔!

"پیاری ریحانہ" ! مجھے معاف کرنا ۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں ۔ میں نے اس جذبے کو دبانے کی لاکھ کوشش کی ——— مگر ——— آہ ... ! کاش میں یہاں نہ آتا ۔ تم میرے دوست کی ایک غمخوار ایک جائیز بیوی ہو ۔ خدا میرا قصور معاف کرے ——— خُدا ہم دونوں کا قصور معاف کرے" ۔ ریحانہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ——— وہ کچھ گھبرا سی گئی ۔ اور اُسی گھبراہٹ میں اُس نے معصومانہ انداز میں امتیاز سے کہا! ——— "میں تم سے محبت کرتی ہوں ۔ میرے جذبات میں ہلچل پیدا ہوئی ۔ مجھے احساس پیدا ہونے لگا کہ میں جس چیز کی کمی شدت سے محسوس کر رہی تھی وہ مجھے مِل گئی ۔ مجھے پورا یقین ہے کہ عمران میرے ساتھ محبت نہیں کرتا ۔ اور اگر میں اُس سے جُدا بھی ہو جاؤں تو اُس سے کوئی صدمہ نہیں پہنچے گا ۔ اس طرح ہم دونوں ایک شاد کام زندگی بسر کریں گے ۔ یہ خیال میرے دل و دماغ پر چھا گیا ہے" ۔ اسی اثنا میں اُن دونوں نے یہ فیصلہ کر لیا ۔ کہ عمران کے گھر آنے سے ——— پہلے ہی وہاں ——— سے ——— کہیں اور چلے جائیں ۔ وہ جلدی سے اُٹھی ۔ ضروری اشیا ایک جمع کیں ! اور عمران کے نام ایک خط لکھا ۔ جس کا مضمون اسطرح سے تھا ——— !

"شدتِ مجبوری نے آج مجھ میں یہ جرائت پیدا کی ۔ کہ حالِ دل آپ کو سُنانے جا رہی ہوں ۔ آج میری سمجھ میں آرہا ہے کہ ایسی باتیں زبان سے کہی نہیں جاتیں ۔ ہو بھی سکتا ہے لیکن عزم واستقلال ضروری ہے جس کی مجھ میں کمی ہے بغیر کسی اندیشے کے کہ آپ کی میری نسبت

اس معاملے میں کیا رائے ہو سکتی ہے میں یہ چند سطور آپ کی نذر کئے جا رہی ہوں"

مجھے آپ سے بے لوث محبّت تھی۔ اور میں آپ پر پروانہ وار مٹتی رہی۔ گویا میں جنم جنم سے آپ کی منتظر تھی مگر ——— ! مگر آپ میری محبّت کی قدر نہ کر سکے۔ میں نے اب تک بہت کچھ برداشت کیا۔ مگر اب اور برداشت کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں۔ آپ کو اب تک معلوم ہو چکا ہو گا کہ مجھے امتیاز سے محبّت ہے آپ کا گذشتہ سلوک اس بات کا آئینہ دار ہے کہ آپ کو میرے ساتھ ہرگز ہرگز محبّت نہیں۔ اس لئے میں اپنی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے آپ سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو رہی ہوں ...... "ریحانہ"

رات بھیگ چکی تھی۔ سردی بلا کی تھی۔ وہ دونوں کمرہ سے نکل کر موٹر پر سوار ہوئے۔ ابھی گاڑی چلنے ہی کو تھی کہ عمران کے کمرہ کی کھڑکی کھُلی۔ وہ تصویرِ حیرت بنا کھڑا تھا اُس کے چہرہ سے خوف و اضطراب کے آثار نمایاں تھے۔ وہ متوقع دِن سے پیشتر ہی اپنا کام ختم کر کے واپس آگیا تھا۔ اُن دونوں کو گھر میں نہ پا کر تھکان دُور کرنے کے لئے اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ اور اُن کے موٹر کی آواز سے بیدار ہو کر دیکھنے کے لئے کھڑکی پر آگیا۔ شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب ریحانہ کو عمران کی محبّت کا احساس ہوا اور وہ محسوس کرنے لگی کہ اُس سے میرے غائب ہو جانے سے کافی رنج ہوا گا۔ یہ خیال اُس کے دل پر قابو پاتا گیا۔ اُس نے مضمحل و بیقرار ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنا سر امتیاز کے کندھے پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد موٹر ٹھہری۔ اُس نے آنکھ کھولی۔ تو بے ساختہ زبان سے نکلا۔

"امتیاز۔ ؟ ——— ہم کہاں! پھر گھر؟"

ہاں ریحانہ! امتیاز نے مسکرا کر کہا۔

میں تم سے محبّت ضرور کرتا ہوں۔ میری محبّت نفسیاتی خواہشات سے آلودہ نہیں اور مجھے

تمہارے پاکیزہ احساسات کی قدر ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہارے دِل و دماغ میں عمرآن کا خیال جاگزین ہے ۔ عمرآن کو تم سے حد درجہ محبت ہے ۔ پھر یہ غیر ممکن تھا کہ میں دو دلوں کو توڑ کر آرام و چین سے زندگی بسر کرتا۔

وہ دونوں موٹر سے اُترے ۔ عمرآن اسی طرح بُت بنا کھڑکی پر کھڑا اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دوڑ کر نیچے آیا اور ریحآنہ کو پہلو میں لے کر نہایت سادگی سے کہنے لگا۔

کیا آپ دوسرے شو پر گئے تھے ۔ دیر ہو گئی ہو گی"۔

جی ہاں ——— امتیاز نے سنجیدگی سے جواب دیا" اور میں آج رات اپنے شہر واپس جا رہا ہوں ۔ یہاں پر اب میرا کام ختم ہو گیا ہے"۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے بغیر کسی جواب کا انتظار کئے روانہ ہو گیا۔

ریحآنہ اور اُس کا سرتاج عمرآن اب ایک پُرسکون زندگی گذار رہے ہیں راحت و شادمانی اُن کی پیشوائی میں رہتی ہے ۔ معلوم نہیں کہ عمرآن کو اُس کا خط ملا بھی تھا کہ نہیں ——— نہ ہی اُس نے اس کا ذکر کبھی ریحآنہ کے سامنے کیا اور نہ ہی وہ ریحآنہ کے میز پر پڑا تھا۔

آج وہ اپنے جذبات کے طوفانی موجوں میں ہچکولے کھاتی اُس کنارے پر پہنچ چکی تھی جہاں اُس کی جیون نیا کا کھیون ہار اُس کی زندگی کا مالک اُس کا حقیقی سرتاج اُس کا سچا چاہنے والا عمرآن باہیں پھیلائے اُس کو اپنی آغوشِ محبت میں لینے کو بیقرار کھڑا نظر آیا ——— وہ ڈوبنے سے بچ گئی ۔ لہروں کے تھپیڑوں نے اُسے اپنے عمرآن کے قدموں میں لا ڈالا تھا ۔ وہ اپنی سسکتی اور گھٹتی ہوئی حسرتوں کے داغ دِکھلا کر محبت کی بھیک مانگنا چاہتی تھی ۔ عمرآن کی بے رُخی نے آج تک جو کچھ کے اُس کے معصوم دِل پر لگائے تھے ۔ اُن کی وجہ سے وہ کچھ موہوم سے اندیشوں کے اندھیروں میں بھٹک گئی تھی ۔ مگر اُس کو حقیقت کا اُجالا مِل گیا ۔ اور وہ بے قرار ہو کر بول اُٹھی ۔

"میرے عمران ——— آپ کو میرے حالِ مضطر کی کچھ بھی خبر نہیں ہے۔ کیسے سمجھاؤں میں آپ کو دِل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں۔ اتنا کچھ جانتے ہوئے بھی اگر آپ انجان بنیں گے۔ اور اگر آپ نے مجھے ٹھکرا دیا۔ اگر میرے سینے کی جلتی ہوئی آگ کی ایک بھی چنگاری نے آپ کے ٹھنڈے دل میں کام نہ کیا۔ اور اگر آپ اب بھی اُسی سرد مہری سے پیش آتے رہے۔ تو جانتے ہو۔ میرا آخری چارۂ کار یہی ہوگا۔ کہ میں آپ کی یاد اپنے سینے میں دبائے اس دنیا سے دُور چلی جاؤں گی۔ بہت دُور۔ جہاں شہنشاہی ہوگی۔ محبت کی رسوائی نہیں ——— !!!

لمس کا دھوکا

کالج کے دن بھی کتنے حسین ہوتے ہیں۔ حامدؔ بی، یو، سی کا طالب علم تھا تو کوئی لڑکی فریدہؔ نام کی اس کی آمد کی منتظر ہوا کرتی تھی۔ نہ معلوم کیوں۔ نئے نئے ماحول میں حامد کسی لڑکی سے دل لگانے سے کتراتا تھا۔ مگر فریدہؔ کی جھیل سی آنکھوں میں وہ غیر شعوری طور پر ڈوبتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کو کبھی کبھی کالج سے نکلنے کے بعد بھی فریدہؔ کا دلکش چہرہ، لمبی لمبی پلکیں اور سیاہ گھنے بال بوٹا سا قد اور معنی خیز نظروں سے اُس کی طرف بار بار دیکھنا یاد آجاتا۔

فریدہؔ حامدؔ کے پڑوس ہی میں رہتی تھی۔ اور حامدؔ کا گزر اکثر اُسی گلی سے ہوتا تھا۔ کالج کی لمبی چھٹیوں میں کبھی اُس راستے سے آتے جاتے اُن کی نگاہیں چار ہوتیں۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بے نام سے پیغام ایک دوسرے کو ملتے۔

وہ شباب کا ایک بھرپور مجسمہ تھی اس کی پُر کشش اور حسین شخصیت کالج کے اکثر طلبا کی نگاہوں کا مرکز تھی مگر وہ ہر ایک سے الگ تھلگ اور تمام پرستاروں سے بے نیاز کسی بھی لڑکے سے دل چسپی نہیں رکھتی تھی۔ حامدؔ کے ساتھ اس کا لگاؤ تھا غیر ارادی حرکت تھی، یا یہ بھی یونہی ایک مشغلہ تھا۔

حامدؔ کبھی کبھی اُس کی نظروں کی زبان کے معنی سمجھنے کی کوشش کرتا مگر اُس کی ذہانت اور تعلیمی قابلیت اس کی تہہ میں چھپے مطالب کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

حامد ایک سیدھا سادہ لڑکا تھا۔ کلاس میں اُس سے بھی اچھے لڑکے تھے۔ بڑے گھرانوں کے فیشن ایبل اور شاہانہ ٹھاٹھ والے نوجوانوں کی گھومتی پھرتی نظریں ہر جوان اور خوب صورت لڑکی کے جسم کے زاویوں کو تاکا کرتی تھیں اور کبھی تو کوئی شرمیلی لڑکی ایسی نظروں سے گھبرا جاتی۔ لیکن فریدہ پر شاید کبھی کسی کی نظروں کی بارش، یا نزدیک سے گزرنے والے منچلے لڑکے کی آہوں یا گنگناتے ہوئے فلمی گیت کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس کے خیالوں کے خاکے بالکل سپاٹ اور بے رنگ تھے۔

ایک دن حسبِ معمول حامد کالج کے گیٹ سے اندر جا رہا تھا تو فریدہ زیرِ لب مسکرائی اور حامد کے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور کان سُرخ ہو گئے۔ سینے میں دل دھڑکنے لگا، تیز سانسوں سے اس کے سینہ میں زیر و بم سا پیدا ہو گیا۔ وہ گھبرایا کہ دوسری لڑکیوں نے اگر دیکھ لیا ہو تو ـــــ وہ جلدی جلدی قدم اُٹھا کر اس ماحول سے بچ نکلنے کی کوشش کرنے لگا تو قریب تھا کہ منہ کے بل زمین پر گر جائے۔ اُس نے ایک اچٹتی نظر فریدہ کے سراپا پر ڈالنے کی سعی کی۔ تو فریدہ کی نظریں نسوانی حیا کے بوجھ سے جھک گئیں۔ ـــــ

مہینے بیتے، سال گزرے مگر صرف آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ کبھی کبھی دل کی دھڑکنوں کو زبان نہ ملی۔ ہونٹ پھڑپھڑائے مگر جذبات کی ترجمانی الفاظ کی رہینِ منت نہ ہو سکی۔ بارہا فریدہ کو دیکھ کر اُس کے ہاتھ غیر ارادی طور پر سلام کو اُٹھتے مگر فوراً ہی وہ اپنے آپ پر قابو پا لیتا۔ جیسے کہ اُسے فریدہ کے ساتھ کوئی لگاؤ نہ تھا۔

ایک چھٹی کے دن حامد سیر و تفریح کے خیال سے چشمہ شاہی گیا اور وہاں فطرت کے حسین و دلکش مناظر میں اُسے اپنی ہم درس فریدہ اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھی نظر آئی۔ حامد کے ساتھ بھی اُس کے کچھ دوست تھے۔ وہ سبز مخملیں فرش پر بیٹھی اپنی بہن سے باتیں کر رہی تھی کہ دونوں اٹھ کر پھولوں کی ایک کیاری کی طرف ٹہلنے لگیں اور گھومتا ہوا حامد اس طرف آ نکلا۔ جونہی سامنا ہوا تو بے اختیار

حامد کی زبان سے نکل پڑا۔

"آپ! ——"

اُس نے لمبی لمبی پلکوں کو جھکاتے ہوئے بڑے ناز سے کہا۔

"جی ہاں —— ہیں۔"

اس کی آواز میں مٹھاس تھی، نگاہوں میں رس، جو نہ جانے کتنے سوالوں کا جواب حامد کی نظروں سے طلب کر رہی تھی۔ اُس کی بھولی بھالی ننھی سی بہن دونوں کو دیکھتی رہی مگر شاید کچھ نہ سمجھ سکی۔

اس حسین حادثے کے بعد کئی دنوں تک فریدہ کالج نہیں آئی اور زندگی میں پہلی بار حامد کو کالج کی فضاؤں میں کچھ خلا سا محسوس ہونے لگا۔ وہاں کی رونقیں پھیکی لگنے لگیں، اس کی —— نظریں کسی کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹک کر مایوس ہو جاتیں۔ اندیشہ ہائے دُور دراز نے اس کو عجیب سی ذہنی کشمکش میں ڈال دیا۔ وہ خود ہی دل سے سوال کرتا اور خود ہی جواب دیتا۔ کالج کی رنگینیاں اب اس کے لئے جاذبِ نظر نہ تھیں۔

ایک دن وہ اس راستے سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر دروازے پر کھڑی شوخ و شنگ لباس میں مسکراتی ہوئی فریدہ پر پڑی۔ حسبِ معمول وہ زیرِ لب مسکرائی جو ہمیشہ کی طرح حامد کیلئے محبت کا پیغام ہوا کرتی تھی۔

"کل" —— حامد کے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں اور فوراً ہی وہ چاند سی صورت آسمان پر چمکنے والے برق کی طرح نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

"کل" ——۔

"وہ کل" کو دُہراتا ہوا۔ بھاری بھاری قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ نہ معلوم اس ایک لفظ میں مستقبل کے کتنے حسین تاج محلوں کی تعمیر کی قوت پنہاں تھی۔ اس کو گویا دنیا جہاں کی مسرتوں

کے وعدے مل گئے تھے ۔ اُس نے مڑ کر دوبارہ اُس دروازے کی طرف دیکھنا مناسب نہ سمجھا۔
چار بجے کا عمل تھا۔ کل کب ہو گی ۔ ابھی چوبیس گھنٹے انتظار کرنا ہے ۔ وہ گھر پہنچا تو اس کے جذبات میں ایک ہلچل تھی ، ایک طوفان تھا۔ اُس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے ۔ وہ رات کتنی طویل ہو گئی ۔ انگنت ستاروں کی طرح اُس کے تصوّر کی بساط پر لاکھوں ہی تابناک شمعیں جھلملاتی رہیں ۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی ۔ اس بے قراری میں ایک قسم کی لذت محسوس ہو رہی تھی ۔ وہ کالج گیا تو اس کے جذبات پر فریدہ چھائی ہوئی تھی ۔ پڑھائی میں دل نہ لگ رہا تھا ۔ وہ کھویا کھویا سا تھا۔ وقت کی رفتار بہت دھیمی ہونے لگی تھی ۔

موسم خوشگوار تھا ۔ ہلکی ہلکی ہواؤں میں پیرہنِ یوسفؑ کی سی تاثیر تھی ۔ اُس کے تصوّر میں فریدہ سراپا انتظار اپنی ڈیوڑھی پر کھڑی مسکراتی نظر آ رہی تھی ۔ اپنے ساتھیوں سے کترا کر حامد اکیلے اُس راستے پر پہنچا جہاں صرف ایک لفظ "کل" کے جادو نے اس کو دیوانہ بنا دیا تھا ۔ وہاں پہنچا تو پہلے ہی نگاہوں نے بارگاہِ حسن میں اپنا اضطراب اور بیقراری کا پیغام پہنچانے کے لئے اس دروازے کی طرف دیکھا جو بیوہ کی مانگ کی طرح بے رونق تھا ۔ وہاں کوئی نہ تھا ۔ اس کا دل دھڑکنے لگا ۔ زبان سوکھ گئی ۔ آنکھوں میں چنگاریاں سی مچلنے لگیں ۔

من من بوجھل قدموں سے وہ آگے بڑھ گیا پھر ایک نظر سے پیچھے مڑ کر دیکھا ۔ کوئی آہٹ نہ تھی ، کوئی جلوہ نہ تھا ——— وہ آگے بڑھتا گیا ۔ پھر قدم رک گیا اور اس نے واپسی کا ارادہ کیا تاکہ ایک بار اور اس در کا طواف کرے ۔ بدن پسینے میں شرابور تھا ۔ وہ کئی بار اس گلی کے چکر کاٹنے کے بعد مایوس سا ہونے لگا ۔

" جھوٹی "

" کیا اُس نے میرے ساتھ مذاق کیا ؟ "

آفتاب حسرت ویاس کا خونیں کفن پہنے مغرب کے مقبرے میں اُتر رہا تھا۔ ہر طرف سیاہی چھانے لگی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ خشک ہونٹوں پر اپنی سوکھی زبان پھیر کر اُس نے ایک سرد آہ بھری۔ نڈھال اور مایوس وہ گھر کی طرف ناکام لوٹا۔

ہزاروں خیالات آتے اور جاتے رہے۔ چہرے پر ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں۔ جیسے کہ وہ اپنا سب کچھ لٹا کر آیا ہو۔ دولتِ دیدار سے اپنی جھولی بھرنے کی تمناؤں پر اوس پڑنے لگی۔ شام کے دھندلکے میں ہر طرف غم ویاس کی فضا چھائی نظر آنے لگی۔

یہ رات پھر کروٹیں بدلتے گزری۔ اور صبح کو اُس کا بدن بہت تکان محسوس کر رہا تھا۔ چہرے کی رونق جاتی رہی۔ اُس نے بے دلی سے ناشتہ کیا۔ کتابیں سنبھالے۔ کالج کی طرف روانہ ہوا اور جان بوجھ کر اُسی راستے سے گزرا۔ اُس کے دل میں ہزاروں گلے، لاکھوں شکوے مچل رہے تھے۔ جن کو وہ اپنی فریدہ تک پہنچانے کے لئے بیقرار تھا۔ آج اُس کے بکھرے ہوئے بال اُس کی پریشانی کی داستان سُنا رہے تھے۔ اگر وہ ایک نظر دیکھ لے تو سمجھ جائے گی کہ اُس نے یہ حسین مذاق کر کے اُس کا سارا آرام، رات کی نیند اور دن کا چین لوٹ لیا ہے۔ لیکن دروازہ چوپٹ بند تھا۔ وہ گھٹن سی محسوس کرنے لگا۔ کالج میں اُس کا دل نہ لگا۔

اب وہ کالج اسی راستے سے جاتا اور واپسی پر پھر وہاں سے گزرتے ہوئے ایک نگاہ اُس مکان پر ڈال کر آہ بھرتا جہاں صرف حسرت وناکامی اس کا استقبال کرتی۔ اس کی اُمیدیں اب یاس وحرماں کے اتھاہ سمندر میں ڈوبنے لگیں۔ اس نے فریدہ کو بھلانے کی کوشش کی لیکن جوں جوں وہ اُس کے خیال کو دُور ہٹانے کی کوشش کرتا اس کا حسین جلوہ اپنی پوری رعنائی اور دلربائی کے ساتھ اس کے سامنے نظر آتا اور "وعدہ فردا" کی جادو بھری آواز اُس کو ایک غیر متزلزل اعتماد کے اندھیروں میں دھکیل دیتی۔ وہ کوشش کے باوجود اسی ذہنی خلفشار سے آزاد نہ

ہو سکا۔

مہینوں کی غیر حاضری کے بعد فریدہ پھر کالج آگئی۔ وہ پہلے جیسا رنگین ماحول پھر کالج کی اداس اداس فضاؤں میں گنگنانے لگا۔ خزاں آلود چمن میں پھر بہاروں کی رنگینیاں رقص کرنے لگیں۔ اب روز دیدار ہو جاتے۔ مگر صرف نگاہوں سے حالِ دل سُنایا جاتا اور ہونٹوں کو حرکت نہ ہوتی۔

ایک دن فریدہ ایک چنار کے سائے تلے اکیلی کھڑی تھی کہ حامد نے اُسے دیکھا اور چاہا کہ اُس سے شکایت کرے، وہ تمام گلے جو اُس کے مجروح دل میں بسے تھے۔ وہ اُس طرف سے گزرا مگر بات لبوں پر آکر رُک گئی اور ایک بھرپور نظر سے اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے اپنی لمبی لمبی پلکوں کو جُھکا کر اپنے برگِ گل جیسے نازک ہونٹ ہلا کر کہا۔

"مجبوری ———"

بس ایک لفظ کی تفسیر میں خوابِ جوانی کی ساری تعبیریں اور کتابِ دل کی ساری تفسیریں چھپی تھیں۔

"مجبوری ——— عورت مجبوری ہی کا دوسرا نام ہے"۔

اس ایک لفظ میں وہ جادو تھا کہ حامد کے دل سے سارا گردِ ملال دُور ہو گیا اور اُس نے فریدہ کو اپنانے کے منصوبے بنانے شروع کئے۔ کتنی حسین ہے فریدہ۔ شبنم کی طرح معصوم اور حوروں کی طرح پاکیزہ۔ زندگی اس کے بغیر ادھوری ہے اُس نے دل کی گہرائیوں سے فیصلہ کر لیا ———

اور پھر وہ دونوں زیادہ نزدیک آتے گئے اور کبھی کبھی لائبریری روم میں، کبھی کنٹین میں، کبھی کلاس میں جاتے اور نکلتے وقت دونوں مل لیتے اور ایک دو باتیں بھی ہو جاتیں۔ کبھی حامد فریدہ کے لئے NOTES بناتا اور اس میں اپنی محبت کی درد بھری کہانی بھی لکھ دیتا۔ فریدہ دیکھتی ضرور ہوگی مگر نہ تو اُس نے کبھی اس کا جواب دیا اور نہ ہی ناراضگی کا اظہار ——— بس اُس کی خاموشی ہی میں حامد کو اقرار کے سارے پہلو چھپے نظر آتے تھے اور وہ بھروسہ کرنے لگا تھا کہ فریدہ اس کی ہے اور اُسی کی رہے گی۔

کالج کا آخری سال تھا۔ دونوں امتحان کی تیاریوں میں دل لگا کر مصروف ہو گئے اور اس دوران جب کبھی ملاقات ہوتی تو امتحان سے ہی متعلق بات چیت ہوتی۔ لیکن زبان کے اظہار کے بغیر ہی دل کی باتیں نظروں سے سُنائی جاتی۔

کئی بار حامد نے چاہا کہ فریدہ سے پوچھ لے کہ بس امتحان کے بعد ہی ہم دونوں..... لیکن وہ بارہا اس خیال کا تحریری طور پر اظہار کر چکا تھا ــــــ

امتحان ختم ہوا ــــــ اور عرصہ تک ملنے جلنے کی کوئی راہ نہ نکلی۔ کبھی کبھار کوچۂ جاناں کا طواف کرنے کے لئے حامد کا دلِ دلِوانہ اُسے اُس کوچہ سے گزرنے پر مجبور کرتا کہ ایک دن ــــــ حامد نے اُس گھر میں شہنائیوں کی آواز سُنی۔ حامد کا دل دھڑکنے لگا۔ فریدہ کسی اور کی ہونے والی تھی۔ وہ گھبرا اُٹھا۔ اس کی تمام اُمیدوں پر پانی پھیر گیا۔ اُس کی تمام آرزوئیں دم توڑ گئیں۔ اُسے خیالوں کی دُنیا میں بھی اپنی منزل دکھائی نہ دی وہ ماضی میں کھو گیا اور مستقبل کے بارے میں سوچنا اُس کے بس سے باہر ہو گیا۔ اُس کے تصورات کے حسین شیش محل بارِ الم سے چکنا چور ہو گئے اور سپنے بکھرتے دکھائی دینے لگے۔

وہ اُس رنگ برنگی قمقموں سے آراستہ حویلی نما مکان کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اور اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ حویلی اُس کی اپنی جھونپڑی پر انسانوں کی طرح خندہ زن ہو کر مذاق اُڑا رہی ہو۔

یوں مِلا ہمیں سہارا

"زندگی ایک حسین خواب ہے"۔ یہ کہاوت تو میں نے سُنی ہے اور اس کو سمجھنے کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر عملی طور پر تجربہ نہ تھا۔ رضیہ نے سرد آہ بھرتے ہوئے انجم سے کہا۔ تو وہ کہنے لگی۔

"کیوں خیریت تو ہے نا ـــــ؟"

ہاں خیریت ہی ہے اور اسی لئے میں تم سے کہہ رہی ہوں۔ یہ حسین سپنے ایسے ہیں جو اکثر ٹوٹ جاتے ہیں نازک جو ٹھہرے ـــــ

وہ اپنی خوشی کے لئے اس کھلونے سے کھیلتا رہا۔ جب اُس کو دوسرا کھلونا مل گیا۔ تو اُس نے اس کھلونے کو ایک پتھر پر دے مارا۔ جس سے ٹکراتے ہی یہ چُور چُور ہو گیا۔ اور ہمیشہ کے لئے شاید بیکار بھی۔

"واقعی۔ رضیہ" ـــــ انجم نے پوچھا۔

ہاں۔ انجم اعتبار کرو! جب میں نے تمہاری کہانی سُنی تو یہ اندیشہ ہوا۔ کہیں تمہارا حال بھی میرا جیسا نہ ہو۔ اور تم سے ملنے والا تمہیں بھی ایک دن کھلونا بنا کر ایک ایسے ہی پتھر پر نہ دے مارے۔ جس سے ٹکرا کر تم بھی ٹوٹ کر ہمیشہ کے لئے بیکار ہو جاؤ۔

میں سمجھی نہیں ـــــ انجم نے رضیہ سے پوچھا۔ "یہ تو آپ بخوبی جانتی ہو کہ ہم دونوں لڑکیاں ہیں"

رضیہ۔ تم اصل میں کہنا کیا چاہتی ہو۔ صاف صاف بتاؤ نا۔ میرا دل دھڑک رہا ہے۔ انجم نے

پھر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ وقت کا انتظار کرو۔ خود بخود سمجھ جاؤ گی"۔ رضیہ نے مختصر جواب دے دیا۔

"آخر ماجرا کیا ہے"۔ انجم نے پریشانی کی حالت میں رضیہ سے پوچھا۔

ہا ہا ہا ——— رضیہ ہنس پڑی!

"اپنے ارمانوں کا جنازہ لئے ہوئے۔ اس کے ارمانوں کی حسین قاتلہ اُس کے جذبات کو مجروح کر رہی تھی اور رضیہ اُسے محسوس تک نہ ہونے دیتی تھی۔ کہ تم ہی تو ہو۔ جس کی وجہ سے شاید میں ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گئی ہوں ———!" کاش میں نے تمہیں بہن نہ کہا ہوتا۔ ایک تو میں لُٹ چکی ہوں۔ دوسرا یہ تمہارا اصرار مجھے اور پاگل نہ بنا دے۔ مجھے اب ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور نہ ہی میں اظہار کر سکتی ہوں ———!

ایک بہن کی خاطر اتنا ضرور بتاؤں گی۔ چاہے بعد میں میری ہنسی ہی اُڑاؤ!

رضیہ۔ پلیز رضیہ بتاؤ نا۔ انجم نے بھولی صورت بنا کر رضیہ سے پوچھا۔

انجم پہلے یہ تو بتاؤ۔ جس سے تم پیار کرتی ہو۔ وہ کون ہے۔

ایک اچھا اور خوبصورت لڑکا۔ انجم نے مزاحیہ انداز میں جواب دے دیا ———

ہا ہا ——— ؟ رضیہ نے ہنس کر نام پوچھا۔

وحید ——— انجم نے مختصراً کہا۔

"رضیہ کا دل یہ نام سُن کر ڈوبنے لگتا تھا۔ رضیہ کی خاموش نگاہیں انجم کے بھولے چہرے کو دیکھ کر چیخنا اور چلانا چاہتی تھیں مگر ———"

کیا وہ تم کو سچ مچ چاہتا ہے؟ رضیہ نے سوال کیا۔

تم کیسی اُلٹی سیدھی باتیں کر رہی ہو۔ اور میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی ہوں! اُن کی باتوں میں اتنی

مٹھاس ہے۔ کبھی مل کے تو دیکھو۔ ایک بار مل جائے تو ایسا لگتا ہے۔ جیسے وہ کئی برسوں کے جانے پہچانے ہوں۔ انجم نے اس بھولے انداز میں جواب دے دیا۔ جیسے وہ ان کے دل کی دھڑکن کو چھونے والی اور کبھی نہ جدا ہونے والی بات ہو ــــــ

رضیہ کے دل پر تیر چل رہے تھے۔ مجروح دل اور مجروح ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ مگر وہ رو نہیں سکتی تھی۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ کاش انجم میرے سامنے نہ ہوتی۔ اور میں پھوٹ پھوٹ کر روتی۔ اپنے من کا بوجھ ہلکا کر لیتی۔ اتنا روتی کہ کبھی اُن کی یاد تک نہ آتی۔ مگر۔! مگر میں کیا کروں جسے میں اپنا سمجھتی رہی۔ وہی بیگانوں میں نکلا اور شاید مجھے ایسے بھول گیا۔ جیسے ہم کبھی ملے بھی نہ تھے۔ حالانکہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمیں ایک نہ ایک دن ضرور ملنا ہے۔ جی ہاں ایک سال پہلے اُن کی منگنی بھی ہو چکی تھی۔ یہ تو میرا ہی قصور ہے۔ کہ میں نے اُن کو دل دینے کی اتنی بڑی ہمت کی تھی۔ کہ اب میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہ رہی۔

رضیہ سوچتی رہی۔ اُس کا دماغ اَن گنت سوالوں کا جواب طلب کر رہا تھا۔ وہ پریشان تھی۔ ہنس کر بات کرنا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ ہر وقت سوچتی تھی کہ اب میں کیا کروں۔ کسے کہوں۔ کون سُنے گا اب میری بدقسمتی کے حالات۔ یہ تو سنانے کے قابل بھی نہیں ہیں۔

ہر پل رونا۔ ہر گھڑی ہنسنا۔ پاگلوں کا سا رول ادا کرنا۔ رضیہ کی زندگی کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ رضیہ جواں تھی۔ خوبصورت تھی۔ شباب سے بھرے جسم والی ایک حسین اور پُرکشش شخصیت کا نام تھا۔ مگر آج اُس کا وہ سارا حُسن سب کچھ برداشت کرتے کرتے ماند پڑ گیا تھا۔ اور اتنا سارا ہو کے بھی وہ آج زندہ ہے۔ سوچتی تھی میں مروں گی بھی کیونکر۔ اُس کے لئے۔ کیا اُسی کے لئے جو میرے لئے کچھ نہ کر سکا۔ جو میرا ہوتے ہوئے بھی دوسروں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے۔ کیا میری آنکھیں یہ تماشا دیکھتی رہیں گی۔ آنسو بہاتی رہیں گی۔ کب تک۔ آخر کب

تک ——— !

چلو میرا صبر میری ہمت ایک نہ ایک دن ضرور رنگ لائے گی۔ وہ اپنے آپ کو سہارا دیتی ہوئی اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ خیالوں میں کھو گئی تھی"۔

رضیہ۔ کیا سوچ رہی ہو۔ تم چُپ کیوں ہو گئیں۔ تم بولتی کیوں نہیں ہو۔ انجم نے رضیہ کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ رضیہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اور لب مُسکرائے۔ وہ جلدی بول پڑی۔ تاکہ انجم محسوس نہ کرے!

مجھے بولنا ہی کیا ہے۔ میری بولتی کب کی بند ہو چکی ہے۔ اب دعوت کب کھلا رہی ہو۔ رضیہ نے انجم سے پوچھا۔؟

کیوں بنا رہی ہو۔ دیکھو بہن ایک بات پوچھوں۔ انجم نے کہا۔

ہاں پوچھو۔ رضیہ نے جواب دیا۔

تم وحید کو جانتی ہو۔ انجم نے سوالیہ نگاہیں رضیہ کے چہرے پر گاڑ دیں۔

نہیں ابھی تک تو نہیں۔ میں تو پہلے تم کو بھی نہیں جانتی تھی۔ ملنے پر ہی ایک دوسرے سے پہچان ہو جاتی ہے۔ مگر انجم آج کی بے تکلفی کہتی ہے۔ کہ ہم دونوں جیسے جنم جنم کی دو جڑواں بہنیں ہوں۔

انجم ہنس پڑی اور کہا مجھے بھی ایسا ہی کچھ لگ رہا ہے۔

رضیہ ——— تم اپنی دعوت کب کھلا رہی ہو۔

میں ——— رضیہ نے اِدھر اُدھر نظریں گھمائی اور کہا۔

ابھ ——— ابھی ——— ابھی تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی ہوں۔ ویسے بھی جب وہ چاہیں۔ تو ضرور کھلاؤں گی۔

اچھا تو تم نے ان کا نام نہیں بتایا۔ انجم نے رضیہ سے پوچھا۔

نام ——— تم نے تو پوچھا نہیں۔ رضیہ چاہتی تھی کہ وہ بھول جائے مگر وہ بھولی نہیں۔

اُس نے پھر پوچھا۔ بتائیے نا۔ اُن کا نام کیا ہے۔

اُن کا نام بھی وحید ہے۔

وحید ——— انجم نے رضیہ کا کہا دُہرایا۔

ہاں — تم چونک کیوں گئی۔

کچھ نہیں ——— یہ سوچ رہی تھی۔ کہ دونوں کا نام ایک ہے۔

تمہارا وحید ——— میرا وحید۔

ہاں ——— رضیہ نے مختصراً جواب دے دیا۔

رضیہ دل ہی دل میں خون کے آنسو بہا رہی تھی۔ مگر انجم کو محسوس ہونے نہ دیتی تھی ——— وہ کہنا چاہتی تھی۔

"یہ تمہارا آج کا وحید گذرے ہوئے کل کا میرا ہی وحید ہے مگر کہہ نہ سکی۔"

بہن انجم ——— اب مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں چلوں! اگر قسمت نے ساتھ دیا۔ تو پھر کبھی ملیں گے۔ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر — اچھا — خدا حافظ۔ رضیہ نے انجم سے کہا۔

کئی روز ہوئے۔ رضیہ نے وحید کو نہیں دیکھا۔ وہ روزانہ ملنا۔ انتظار کرنا۔ آپس میں پیار کی باتیں کرنا۔ وحید سب کچھ بھول چکا تھا۔

ایک دن کا واقعہ یاد کر کے رضیہ آج بھی خون کے آنسو بہاتی ہے۔

انجم وحید کے ساتھ ہنسی مذاق میں محو باتیں کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ کہ اتفاقاً رضیہ کا گذر بھی اسی راستے ہوا۔ وہ اُن کے پیچھے پیچھے ہو لی۔ اور سوچنے لگی۔ کہ میں انجم سے کہہ دوں۔

یہ تیرا نہیں بلکہ میرا وحید ہے ـــــ مگر سرد آہیں بھرتی ہوئی چلتی ہی گئی ۔ اس نے وحید کو محسوس ہونے نہیں دیا ۔ اور نہ ہی وحید نے یہ محسوس کیا کہ پیچھے چلنے والی لڑکی میری ہونے والی بیوی ہے ۔ وہ انجم کے ساتھ چل رہا تھا ـــــ بے خبر اور مدہوش ۔ ہنسی مذاق میں محو ۔ جیسے رضیہ نہیں انجم ہی وحید کی بیوی ہو ۔ رستہ کٹ گیا ۔ انجم اپنے گھر پہنچی ۔ وحید نے اپنے گھر جانے کیلئے قدم بڑھائے ـــــ کہ رضیہ نے آواز دی ۔

" اگر آپ کو ایسا ہی کرنا تھا ۔ تو مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا ـــ

بولے ـــــ میں کیا کرتا ہوں ۔

کیا نہیں کرتے ہو ـــ یہی پوچھ لو ۔

رضیہ ـــــ

ہاں ـــ ہاں ۔ رضیہ یہ مجھے چاہتی ہے ۔

اور تم ـــــ

میں ـــ میں نہیں چاہتا ہوں ۔ کہ

ہاں وحید ـــــ میں سب کچھ جانتی ہوں ۔

رضیہ ـــــ "جب آپ سب کچھ جانتی ہو تو ـــــ تو یہ کھیل بھی چند دن کھیلنے دو ۔ کیا فرق پڑتا ہے ـــــ وحید نے کہا "

دیکھئے حضور ـــ اگر آپ زندگی کو کھلونا ہی سمجھتے ہیں ۔ تو کھیلئے ۔ جس کے ساتھ جی چاہئے کھیلئے ۔ مجھے چھوڑ دیجئے ۔ مجھ سے ہی کنارہ کر لیجئے ۔ رضیہ کی آواز میں حقارت تھی ۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے ـــــ وحید نے غصیلی آواز میں جواب دے دیا ۔

ہاں ۔ ہاں ۔ میری فکر مت کیجئے ۔ انجم بیچاری کو کیا معلوم کہ میں آپ کی ہونے والی

بیوی ہوں ۔ اگر اُسے معلوم ہوتا ـــــــ ! تو وہ یہ نہیں کہتی ۔

"وحید ـــــــ تیرا وحید ! وحید ـــــــ میرا وحید !"

رضیہ آخر تم چاہتی کیا ہو ۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے ـــــــ

"میں ـــــــ میں کچھ نہیں کہنا چاہتی ہوں ۔ صرف آپ سے اتنا کہتی ہوں کہ آپ کی منگنی ہو چکی ہے ۔ اور آپ کو اتنا بھی یاد دلاتی ہوں ۔ کہ میں آپ کے نام کے ساتھ بدنام ہو چکی ہوں ۔ وہ بھی میرے ہی اپنے کہنے پر ـــــــ !

" اگر میں نے آپ کو اس وقت انجم کے ساتھ نہ دیکھا ہوتا کسی اور نے دیکھا تو ـــــــ !"

" تو ـــــــ ! تو کیا ـــــــ وحید بیچ میں بول پڑا ۔"

"کچھ نہیں ـــــــ کچھ نہیں وحید ۔ کبھی تو کسی مظلوم لڑکی پہ رحم کھاؤ ۔ عورتیں تو روزِ ازل سے ہی مظلوم رہی ہیں ۔

وحید ـــــــ آپ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایسی بھول کیوں کر رہے ہیں ۔

رضیہ ـــــــ مجھ پر نصیحتیں کارگر نہیں ہوا کرتیں ۔ اگر چلنا ہے تو چلو ۔ نہیں تو ـــــــ

"نہیں تو ـــــــ ! آپ اکیلے جائیں گے ۔ یہی نا ـــــــ یہ میں جانتی ہوں ۔ میں یہ اندازہ کب کا لگا چکی ہوں ۔

چلے جاؤ ـــــــ ! چلے جاؤ ـــــــ"

چلے جاؤ وحید ۔ مگر یہ مت بھولو ۔ کہ میری بھٹکتی روح آپ کو کہیں چین سے رہنے دے گی ۔ کبھی نہیں ـــــــ میری یاد آپ کو ضرور آئے گی ۔ اور ساتھ ہی یہ بھی مت بھولئے وحید کہ میں آپ کے لئے مر جاؤں گی ۔

نہیں نہیں ـــــــ کبھی نہیں ۔ میں زندہ رہوں گی ۔ میں نے دنیا میں کئی ایسی بہنیں دیکھی ہیں ۔ جنہوں

نے شادی نہیں کی۔ یا جنہوں نے پیار میں دھوکا کھا کر پھر کبھی شادی کا نام نہ لیا۔

"کیا ہوا وحید ——— اگر میرا نام بھی اُنہی کی فہرست میں شامل ہوگا"۔

رضیہ۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ باتیں تم کس سے کر رہی ہو۔ وحید کی آواز میں تمکنت تھی!

جی ہاں مجھے معلوم ہے۔ اور اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ باتیں میں کس سے کر رہی ہوں۔

"آج کے وحید سے ——— جو آج انجم کا وحید ہے۔ ہے نا؟"

وحید ——— اب اگر آپ مجھ سے شادی کرنا چاہیں گے بھی۔ مگر یہ حالات مدِنظر رکھتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچی۔ کہ میں آپ سے شادی نہیں کروں گی۔ حقیقت سامنے آئے گی تو شاید ہی کسی کو میری شادی نہ کرنے پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ رضیہ کی زبان تلوار کی مانند تیز تھی۔ اُس کی آنکھیں نم تھیں۔ لب تھرتھرا رہے تھے۔ گورے گورے گال سُرخ ہو گئے تھے۔ دیوانہ وار کیفیت اُس پہ حاوی تھی۔ وہ کبھی ایک نظر وحید کو اور کبھی ایک آنے جانے والے راہ گُذر کو دیکھتی تھی ———

وحید پر رضیہ کی باتوں کا اتنا اثر ہوا۔ کہ وہ منتیں کرنے لگا اور کہنے لگا۔

"رضیہ میں وہی کروں گا۔ جو تم چاہو گی۔ بس رضیہ! بس ——— مجھے معاف کر دو!

مجھ سے معافی کیوں مانگ رہے ہو۔ میری زندگی برباد ہونی تھی سو وہ ہو چکی۔ اب انجم بیچاری کی جان بھی نہ لیں۔ تو اچھا ہے!

میں جانتی ہوں۔ کہ عورت کا دل کیا ہوتا ہے میں عورت کے دل کی خوب قدر کرتی ہوں وحید۔ صرف آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور ———

"میں برباد زندگی کی آخری مبارک باد آپ کو پیش کرتی ہوں۔ ہو سکے تو ———"

رضیہ نے بات ادھوری چھوڑ دی اور ایک ہچکی لی۔

وحید کے آنکھوں سے بھی آنسو تیرنے لگے اور اُس کے آنسو اس بات کی گواہی دے رہے تھے

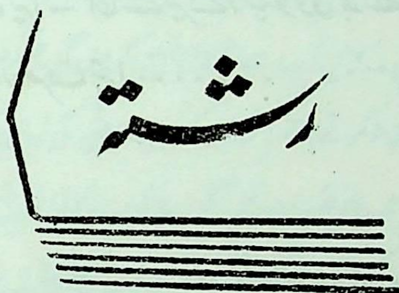
کر وہ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں کرے گا۔ کیونکہ اُس نے محسوس کیا کہ رضیہ پر کیا گُذر رہی ہوگی۔ جس نے مجھے خود رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ وہ دل ہی دِل میں پانی پانی ہوگیا اور رضیہ کی طرف مخاطب ہوکر کہا ــــــ"

نہیں نہیں ـــــــ نہیں رضیہ۔ مجھے معاف کردو۔ مجھ سے ایک بہت بڑی بھول ہوگئی۔

خدا کے لئے مجھ کو معاف کردو ـــــــ

میں تیرا وحید ہوں۔ صرف تیرا ـــ آج سے تیرے وحید کو کوئی تجھ سے جُدا نہیں کرے گا۔

میں تیرا ہوں ـــــــ ہاں صرف تیرا ......


رشتہ

انّو ـــــ آج مجھے تم بہت یاد آرہی ہو۔ نہ جانے کیوں ـــــ؟
کبھی سوچا بھی نہ تھا ـ کہ ایسا ہوگا اور تم مجھے اِس طرح یاد آؤگی

کیا بات ہے ـــــ انّور اپنے آپ سے یہ سوال کر رہا تھا۔

انّو ـــــ میں نے تم سے کبھی پیار بھی نہ کیا تھا ـــــ

میں نے تم کو کبھی دِل سے چاہا بھی نہ تھا ـــــ صرف اپنے ابّاجان اور امّی جان کی ضد پوری کی تھی۔
واقعی آج تم کو کتنے سال ہوگئے چھوڑے ہوئے یاد ہی نہیں آرہا ہے۔

کیا بات ہے ـــــ

انّور تذبذب میں پڑگیا ـــــ اُسے کچھ سُوجھتا ہی نہیں تھا۔

کل رات سے یہاں مسلسل بارش ہورہی ہے۔

او ـــــ ہو ـــــ آج تو چھٹی بالکل ہی نہیں ہونی چاہئے تھی ـــــ

میرا تو ذہن سوچتے سوچتے پاگل سا ہونے لگا ہے!

انّو ـــــ انّو ـــــ میں تمہارے بنا شاید ہی اب رہ سکتا ہوں۔ مجھے تو منی کی بھی رہ رہ کر یاد آتی ہے۔ انّو ـــــ میں تمہیں اپنے قریب دیکھنا چاہتا ہوں ـــــ میرے مرنے میں شاید ابھی بھی ایک مدّت باقی ہے۔ تیرا انّو اپنی زندگی کا ایک اہم حصّہ میرے انتظار میں گذر

گیا۔ میں تیرے سامنے کونسا منہ لے کر آؤں ——— میری انو ———
مجھے آج بھی تمہیں اپنا کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن۔ آج صبح سے ہی میرے دل میں یہ خلش سی
کیسی ہے ———؟

میں اپنے اطراف کے پُرسکون ماحول کا بغور پھر سے جائزہ لیتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں۔ کہ آج صرف
مجھے تیرا تصور ہی پیچھا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

تیری زندگی کی کتنی ہی شامیں تمہیں تنہا اور اُداس چھوڑ کر گذر جاتی ہوں گی ——— کیا
اِن تنہائیوں میں کبھی تمہیں میری یاد آئی۔ ضرور آئی ہوگی ——— مجھے معلوم ہے۔ کہ تم میرے بغیر جی نہیں
سکتی تھی۔ پھر یہ اتنا لمبا چوڑا عرصہ کیسے بیت گیا۔ پتہ ہی نہیں چلا۔

وہ کبھی کرسی پر کہنیاں ٹیکے خاموش بیٹھا تھا اور کبھی نظریں اِدھر اُدھر گھما پھرا کر جھلملاتی ہوئی
مدھم سی روشنی میں بس یہی کوشش کرتا تھا۔ کہ میری بات کا موضوع بدل جائے۔ اور مجھے تھوڑی دیر
کے لئے سکون میسر ہو۔

باہر ہو رہی بارش کو تکتا ہوا وہ پانی کے بلبلوں کی اور دیکھتا تھا۔ دُکھ اور درد کسی کا بھی ہو۔
کیا احساس یکساں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں نا۔ جس تن لاگے وہی جانے!

او ——— ہو ——— یا اللہ یا خدا۔ مجھے یہ کیا ہو گیا۔ میں نے آج صبح کس کا
مُنھ دیکھا تھا۔ جو دن بھر سے میری یہ حالت ہو رہی ہے۔ وہ اُداس سا ہو گیا ——— اور اپنی
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ——— اپنے دل کی گہرائیوں سے ——— اپنے ذہن کے بند دریچوں سے۔
بس اب یہی سوچتا رہا۔ کہ کیوں نہ خط لکھا جائے؟

مگر کیسے لکھوں؟ آج ——— ہاں یاد آیا مہینے کی دوسری تاریخ ہے کب ہم
دونوں الگ ہوئے تھے۔ یاد ہی نہیں ——— آج سے شاید تین سال پہلے ———

وہ خیالوں میں تانے بانے بُننے لگا تھا اُس کے تو پلے ہی کچھ نہ پڑتا تھا۔ کہ اب کیا کیا جائے۔

کیوں نہ ماں کو خط لکھوں اور انّو اور منّی کا ذکر کروں ــــ مگر وہ کیا سوچے گی۔ کہ اتنے عرصے کے بعد وہ خود لکھ رہا ہے جب کہ وہ جاتے وقت دعوے سے بول کے گیا تھا ــــ کہ بس اب اس گھر میں یا تو انّو رہے گی یا میں ــــــ (کیوں رے انور ــــ یہی تھے نا تمہارے وہ تلخ لفظ جو تم نے انّو کو گھر سے نکالتے وقت استعمال کئے تھے ــــــ) وہ اپنے آپ کو کوستا تھا۔

"میں کیا کروں ــــــ میری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا ہے۔" وہ کتنے ہی سوالوں کے جوابات اپنے ذہن کے بند دریچوں سے طلب کر رہا تھا ــــــ یہ وہ سوالات تھے۔ جو آج سے تقریباً تین سال پہلے انور نے اپنے ذہن میں قید کر رکھے تھے۔ مجھے تو ہر کسی سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ میں کسی کی سُنتا بھی نہیں تھا ــــــ حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ سب رشتے دار، ماما، چاچا وغیرہ مجھے یہ سب کرنے سے روک رہے تھے۔ نہ جانے کس کی نظر لگی تھی ــــ انّو کے پیار کو: میرا تو پہلے ــــــ انّو کے ساتھ پیار ہی کب تھا؟"

مگر انّو ــــ

شاید اُسی کے پیار نے مجھ آج اتنا بیقرار کیا ہے۔ اُسی کے صبر و تحمل نے مجھے آج یہ سب کچھ سوچنے پر مجبور کیا ہے۔

" واہ رے انور ــــــ تیرا تو جواب ہی نہیں۔ ہماری تہذیب، ہمارا تمدّن، ہمارے اعلیٰ اوصاف، ہمارے شہری اصول، پرانی ریت روایت، پرانی قدریں کیا صرف کتابوں کی زینت ہیں۔ ہم انہیں اپناتے سے گریز کیوں کرتے ہیں؟ ــــ کیا ہم اپنے آپ کو فریب نہیں دیتے۔ کیا ہم اپنے آنے والی نسلوں پر بدنُما دھبے تو نہیں ہیں؟ ــــــ کل کو جب میری مُنّی اپنی ماں سے یہ پوچھے گی ــــــ "بتاؤ ــــــ میرے پاپا کہاں ہیں؟" تو وہ صاف صاف بتا

دے گی" بیٹی! بات اِس طرح تھی ۔ کہ تمہارے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

او ——— ہو ——— میرا تو آج یہ سب سوچتے سوچتے دم سا گھُٹ رہا ہے ——

جو کچھ مجھے پہلے سوچنا چاہئے تھا ۔ وہ سب مجھے آج کیوں یاد آرہا ہے ؟

تین سال کا عرصہ ——— شاید زیادہ نہیں ہوتا ہے ——

وہ اپنا سر فخر کے ساتھ بُلند کئے ہوئے وہی دعویٰ آج بھی بول رہا ہے —— جو آج سے تقریباً تین سال پہلے کیا تھا"

ٹک ٹک ——— دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا ——— دیکھا تو پوسٹ مین تار لے کر آیا تھا ——— ڈاکیہ چلا گیا ——— اور انور دروازے پر ہی تار کھول کے پڑھنے لگا کہ اُس کے ماتھے سے پسینہ چھوٹنے لگا ۔

"انور ——— انو ہسپتال میں ہے ۔ سکول جاتے ہوئے وہ ایک بس سے ٹکرا گئی ——— ابھی دُو دن ہوئے اُس کی حالت سُدھر ہی نہیں رہی ہے ۔ اور آج صبح سے ہی انور ——— انور کہہ رہی ہے ———"

او ——— تو یہ سب تھا ——— جو آج صبح سے میں بھی محسوس کر رہا تھا ۔

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ دروازے پہ اپنا سر ٹیکتا ہے ۔

پتہ

واجدہ تبسّم

(۱) گورکولین۔ ملچر عالیکدل۔ سری نگر ۱۹۰۰۰۲
(۲) دُور درشن کیندرا۔ سرینگر ۱۹۰۰۰۱

DOLTI DUNYA

By

WAJIDAH TABASUm